احمد سلیم سلیمی

Writer's email address: asaleemi004@gmail.com

بازی

صوبائی دارالحکومت کی سب سے بڑی سرکاری یونی ورسٹی کے کرکٹ گراؤنڈ میں اس وقت بڑے ہی کانٹے کا میچ جاری تھا۔ شعبۂ معاشیات کی ٹیم بیٹنگ کر رہی تھی۔ اس کے 12 اوورز میں 72 سکور پر پانچ کھلاڑی واپس پویلین لوٹ چکے تھے۔ اس سے پہلے شعبۂ صحافت کی ٹیم نے مقررہ بیس اوورز میں 155 رنز بنا لیے تھے۔ اس لحاظ سے شعبۂ معاشیات کی ٹیم کے لیے مطلوبہ ٹارگٹ حاصل کرنا فی الحال جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

کرکٹ میں ویسے تو آخری گیند تک بازی پلٹ سکتی ہے لیکن شعبۂ معاشیات کے پانچ بہترین کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔ وکٹ کیپر بیٹسمین انوار احمد بڑی دیر سے کریز پر ڈٹا ہوا تھا۔ وہ سست کھیل رہا تھا مگر صورتحال کی نزاکت کے پیشِ نظر وکٹیں بچانے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ دوسرا کھلاڑی شعیب احمد ابھی ابھی آیا تھا۔

شعیب احمد نامی یہ لڑکا ویسے تو آل راؤنڈر کے طور پر جانا جاتا تھا مگر اس کی بیٹنگ صلاحیت

کی وجہ سے ہی وہ ٹیم میں شامل کیا گیا تھا۔ اس نے پورے ٹورنامنٹ میں اس سے پہلے کوئی میچ نہیں کھیلا تھا۔ اس میچ میں بھی وہ اتفاقیہ طور پر منتخب ہوا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ اس پوزیشن پر جو کھلاڑی کھیلتا تھا اس کی کمر میں اچانک درد اٹھا تھا۔ ڈاکٹر سے معائنہ کرانے کے بعد اس نے آخری لمحوں میں معذوری ظاہر کی تھی۔ شعبۂ معاشیات کی منیجمنٹ اور کپتان نے مجبوری کے تحت شعیب احمد کو شامل کیا تھا۔ اس نے باؤلنگ بھی کی تھی۔ کپتان نے اسے دو ہی اوور پھینکنے کا موقع دیا تھا جس میں اس نے پندرہ رنز دیے تھے اور کوئی وکٹ حاصل نہیں کی تھی۔ اب اس کا اصل امتحان بیٹنگ میں تھا۔ اتفاق سے اسے ایسے موقع پر بیٹنگ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا جب ٹیم کے بہترین کھلاڑی آدھے سے کم سکور پر باہر ہو چکے تھے۔

یونی ورسٹی میں سالانہ سپورٹس گالا کے سلسلے کا یہ میچ معاشیات کی ٹیم کے لیے بہت اہم تھا۔ اسی میچ میں کامیابی کے بعد وہ سیمی فائنل میں جگہ بنا سکتے تھے۔ مخالف ٹیم یعنی شعبۂ صحافت کی ٹیم پہلے ہی سیمی فائنل میں پہنچ گئی تھی۔

اگلے تین اوورز میں سکور نوے تک پہنچ گیا۔ اس میں شعیب احمد نے دس رنز بنا لیے تھے۔ یونی ورسٹی گراؤنڈ کے اطراف بیٹھے اور کھڑے طلباء و طالبات اپنی ٹیموں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ تالیاں بجا رہے تھے۔ نعرے بلند کر رہے تھے۔ ان آوازوں میں شعبۂ صحافت کے سٹوڈنٹس کا جوش و خروش اور شور و غل زیادہ تھا۔ کیوں کہ انہیں اپنی جیت یقینی نظر آ رہی تھی۔ 156 رنز کے تعاقب میں پندرہ اوورز کے بعد محض 90 رنز اور پانچ کھلاڑی آؤٹ۔ یہ ایسی صورتحال تھی کہ معاشیات کی ٹیم کے حامی طلباء و طالبات کی امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔ ان کے اندازے کے مطابق ان کی ٹیم سیمی فائنل کی دوڑ سے باہر ہو چکی تھی۔

کرکٹ میں اکثر معجزے رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس دن بھی ایک ناقابل یقین کرکٹ کھیل کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ شعیب احمد، جس نے پورے ٹورنامنٹ میں اس سے پہلے ایک بھی میچ نہیں کھیلا تھا۔ ایک طرح سے وہ ایک انڈرڈاگ قسم کا کھلاڑی تھا۔ اس نے بازی پلٹ دی۔

شعبۂ معاشیات کو آخری پانچ اوورز میں 80 سے زیادہ رنز درکار تھے۔ شعیب احمد نے سولہویں اوور میں دو چھکے اور دو چوکے لگا کے جیسے خاموش جھیل میں تلاطم پیدا کر دیا۔ گراؤنڈ کے باہر اس کی ٹیم کے حامی طلبا و طالبات نے یقینی شکست کے احساس کے باوجود، اس کے جارحانہ سٹروکس کو زبردست تالیوں اور شوروغل سے سراہا۔

اگلے اوور کے آغاز میں ہی ٹیم کو بڑا جھٹکا لگا۔ پہلے سے جما ہوا کھلاڑی انوار احمد بھی تیز کھیلنے کی کوشش میں آؤٹ ہو کر باہر چلا گیا۔ اس کی جگہ کھیلنے والا لڑکا ایک لمبا تڑنگا باؤلر تھا۔ اب سارا بوجھ شعیب احمد کے کندھوں پر تھا۔ کسی کو بھی امید نہیں تھی وہ کچھ ایسا کر دکھائے گا کہ ٹیم کی ڈوبتی کشتی کو ساحل سے ہم کنار کر دے گا۔ اس وقت کوئی بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسی اننگ کھیلے گا جس سے اس کی ذاتی زندگی بھی طوفانوں کی زد میں آجائے گی۔

سترھویں اوور میں ایک کھلاڑی آؤٹ ہونے کے باوجود وہ دس رنز بنانے میں کامیاب ہو سکے۔

اب اگلے تین اوور میں 53 رنز درکار تھے۔ شعبۂ صحافت کا مشہور سپن باؤلر گیند پھینکنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے سامنے شعیب احمد اپنا بلاّ تھامے کریز پہ موجود تھا۔ اس نے پہلی گیند سویپ کرنے کی کوشش کی مگر لانگ لیگ پہ کھڑے فیلڈر نے بالکل باؤنڈری لائن پہ اسے روک لیا۔ اس دوران دو رنز بنانے کا موقع مل گیا تھا۔ اگلی گیند کو مڈ آن کی طرف اونچا کھیلا۔

گیند ہوا میں بلند ہوئی۔ جس رفتار سے گیند اڑ رہی تھی اس سے سبھی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ گیند فیلڈر کے ہاتھوں میں لینڈ کرے گی مگر اس دن قسمت شعیب احمد کے ساتھ تھی۔ گیند فیلڈر کے ہاتھوں میں آ کر پھسل گئی پھر تیزی سے چار رنز کے لیے باہر چلی گئی۔ وہ بال بال بچ گیا تھا۔

پھر اگلی تین گیندوں کا اس نے جو حشر کیا اس سے پورے گراؤنڈ میں جیسے ایک محشر بپا ہو گئی۔ مخالف ٹیم کے خطرناک باؤلر کی تین مسلسل گیندوں کو اس نے باؤنڈری سے باہر چھ رنز کے لیے پہنچا دیا۔

سب حیران تھے۔ مخالف ٹیم والے پریشان تھے۔ انہیں یقین نہیں ہو رہا تھا ایک بے جان میچ میں اس نے ایسی جان ڈال دی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے تک جیت کا جشن منانے والے، شکست کے خوف سے پریشان تھے۔ اٹھارہویں اوور کی آخری گیند پہ دو رنز بنانے کا موقع ہونے کے باوجود اس نے ایک رن بنا کے اگلے اوور میں سٹرائیک اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ اس اوور میں اُس نے ٹیم کے مجموعی سکور میں 25 رنز کا اضافہ کر لیا تھا۔

اب آخری دو اوورز میں 28 رنز درکار تھے۔ ٹارگٹ اب بھی مشکل تھا۔ اندیشے اب بھی پھنکار رہے تھے لیکن شعیب احمد نے پچھلے چار پانچ اووروں میں جس بے مثال بیٹنگ کا مظاہرہ کیا تھا، اس نے امیدوں کو زندہ کر دیا تھا۔ شعبۂ معاشیات کے طلبا و طالبات اور ڈگ آؤٹ میں بیٹھے ٹیم کے ساتھی ایک نئے جوش اور جذبے کے ساتھ شعیب احمد کے کمال کے منتظر تھے۔

ٹیم کے سارے ساتھی جوشِ مسرت سے بازو لہرا لہرا کے اسے داد دے رہے تھے۔ اس کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے لیکن ایک کھلاڑی ایسا بھی تھا جو بالکل خوش نہیں تھا۔ وہ شدید ناپسندیدگی اور ناگواری سے اس کی ناقابلِ یقین بیٹنگ دیکھ رہا تھا۔

وہ کوئی مخالف ٹیم کا کھلاڑی نہیں تھا بلکہ شعبۂ معاشیات کی ٹیم کا کپتان جنید رضا تھا۔ وہ رقابت کے جذبے سے بھرا ہوا، سلگتی ہوئی نظروں سے شعیب احمد کو مردِ میدان بنتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ باقی ساتھیوں سے الگ تھلگ کرسی پہ بیٹھا، اپنے اندر ابلتے حسد اور کینے کے لاوے کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچانک اس نے محسوس کیا کوئی اس کے قریب آ کے کھڑا ہوا تھا۔ پھر بے تحاشہ شور وغل میں کسی نے جھک کر اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے جنید؟ ہم نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو گا۔ اگر اس نے یہ میچ جتوا دیا تو آگے اسے روکنا مشکل ہو جائے گا۔''

جنید رضا نے چونک کر، سر گھما کر دیکھا۔ وہ اس کی ٹیم کا اہم کھلاڑی جعفر تھا۔

''میں خود بھی پریشان ہوں جعفر!'' اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''یہ کم بخت تو چھپا رستم نکلا۔ میچ جیتیں نہ جیتیں، یہ تو ہیرو بننے میں کامیاب ہو گیا ہے۔''

جعفر بے نیازی سے بولا۔ ''کوئی بات نہیں۔ اگر آج اس کا دن ہے تو اسے مبارک ہو۔ اتفاق سے ہیرو بن جانے دو۔ ہمارا گروپ اتفاق کرے گا تو دوبارہ زیرو بنا دیں گے۔''

اس بات پہ دونوں ہنسنے لگے۔ مگر یہ ہنسی بڑی کھوکھلی تھی۔ اس دوران 19 واں اوور پھینکنے کے لیے صحافت کی ٹیم کا بہترین باؤلر دوڑنے کی تیاری کر رہا تھا۔ شعیب احمد پورے اعتماد اور وقار کے ساتھ سامنے کھڑا تھا۔ یہ اوور فیصلہ کن تھا۔ اسی اوور سے میچ کے نتیجے کا اندازہ ہونے والا تھا۔

باؤلر نے ایک لمبے رن اپ کے بعد پہلی گیند پھینکی۔ یہ بڑا خطرناک باؤنسر تھا۔ گیند سامنے پڑ کے بہت تیزی سے اٹھی تھی۔ پھر اس کے ہیلمٹ سے ترچھی ٹکرائی تھی۔ اس کے بعد

لانگ لیگ کی طرف سے باؤنڈری سے باہر نکل گئی۔ امپائر نے لیگ بائی کا اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ نو بال کا بھی اشارہ کیا۔ اس کے مطابق باؤلر نے لائن کراس کی تھی۔

معاشیات کے حامیوں اور کھلاڑیوں نے جوش و خروش سے آسمان سر پہ اٹھالیا تھا۔ ان کی ٹیم کو اضافی پانچ رنز بھی مل گئے تھے اس کے علاوہ فری ہٹ بھی مل گئی تھی۔

یہ شعیب احمد کے لیے بھی ایک آئیڈیل صورتِ حال تھی۔ فری ہٹ کی گیند یارکر ٹائپ تھی۔ شعیب احمد نے کمال مہارت سے اسے ترچھے بیٹ سے کھیلا۔ گیند پلک جھپکتے تھرڈ مین سے ہوتی ہوئی باؤنڈری کے باہر چلی گئی۔ داد و تحسین اور شور و غل سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس اوور کی ایک ہی لیگل بال ہوئی تھی جس میں 9 رنز بن گئے تھے۔

اب گیارہ گیندوں میں 19 رنز درکار تھے۔ اب بھی میچ پھنسا ہوا تھا۔ اب بھی نتیجہ کسی کے بھی حق میں آسکتا تھا۔

دوسری گیند بہت تیز تھی۔ شعیب احمد نے پوری طاقت سے بلا گھمایا۔ مگر گیند اور بلے کی ملاقات نہ ہوسکی۔ تیسری بال پہ دو رنز بنالیے۔ چوتھی گیند فل ٹاس تھی۔ جیسے پلیٹ پہ سجا کے اسے پیش کی گئی تھی۔ اس نے پورا پورا احترام کیا۔ اسے پورے اعتماد سے مڈ آن کی طرف چھ رنز کے لیے کھیلا۔ پانچویں گیند خالی گئی۔ آخری گیند سے پہلے اس نے اپنے ساتھی کو ایک رن کے لیے اشارہ کیا۔ مخالف ٹیم کا کپتان بھی ان کی حکمت عملی کو سمجھ گیا تھا۔ اس نے اپنے فیلڈر قریب قریب کھڑے کر لیے۔ آخری گیند بہت آہستہ پھینکی تھی۔ شعیب احمد اس کی رفتار سے دھوکہ کھا گیا۔ گیند وکٹوں کے بہت قریب سے ہوتی ہوئی کیپر کے گلوز میں پہنچ گئی۔

اب آخری اوور میں سٹرائیک اس کھلاڑی کے پاس تھی جس نے ایک بھی گیند نہیں

کھیلی تھی۔ شعیب احمد نے اسے بڑی دیر سمجھایا کہ سمجھداری سے کھیلے۔ ایک رن بنانے کی کوشش کر لے۔

آخری اوور میں اب معاشیات کی ٹیم کو گیارہ رنز کی ضرورت تھی۔ یونی ورسٹی گراؤنڈ میں شوروغل، دادوتحسین اور شعیب احمد زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے۔ جس طرح اس نے اپنی مہارت، صلاحیت اور اعتماد سے یہ اننگ کھیلی تھی اس سے سب ہی سوچ رہے تھے کہ شعبۂ معاشیات یہ میچ جیت جائے گا۔

آخری اوور کے لیے جو باؤلر سامنے آیا تھا وہ واضح طور پر سخت دباؤ میں نظر آرہا تھا۔ کیوں کہ پہلی ہی گیند میں وہ اپنا رن اپ بھول گیا تھا۔ اس کے بعد واپس جا کے جب دوبارہ گیند پھینکی تو پریشر کی وجہ سے لیگ سائیڈ پہ بہت بڑی وائیڈ ہوئی۔ وکٹ کیپر نے قلابازی کھا کے بڑی مشکل سے چار رنز ہونے سے بچایا۔ اگلی گیند شارٹ پچ تھی۔ بیٹسمین نے خطرناک رسک لیا۔ بہت زور سے بلا گھمایا۔ گیند بلے سے ٹکرا کے تیزی سے لانگ آن کے باہر چار رنز کے لیے چلی گئی۔ اگلی دو گیندیں بغیر کسی رن کے ضائع ہوئیں۔ شعیب احمد نے آگے بڑھ کے ساتھی بلے باز کو سمجھایا۔ اسے حوصلہ دیا۔ گیند اس کے بیٹ سے نہ بھی ٹکرائے تو تیزی سے دوڑنے کی ہدایت کی۔

اب تین گیندوں پہ چھ رنز درکار تھے۔ چوتھی گیند کے لیے باؤلر دوڑتا ہوا آیا۔ امپائر کے پاس سے گزر کر بال پھینکنے لگا تھا اس کے ساتھ ہی شعیب احمد دوڑ پڑا۔ اس گیند پر بھی بیٹ اور بال کی ملاقات نہ ہو سکی تھی مگر شعیب کی ہدایت کے مطابق بیٹسمین نے دوڑ لگائی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو کراس کیا۔ اس دوران وکٹ کیپر نے گیند تھام لی تھی۔ بیٹسمین کو دوڑتا دیکھ کر اضطراری انداز میں گیند وکٹوں کی طرف پھینکی۔ آخری لمحوں کا پریشر اپنی جگہ تھا، اس نے

دستانے بھی نہیں اتارے تھے اس لیے درست نشانہ نہیں لگا سکا۔ گیند وکٹوں کے قریب سے ہوتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔ اسی اثنا میں شعیب احمد بھی کریز پر پہنچ گیا تھا۔ اگر گیند وکٹوں سے ٹکراتی تو وہ صاف آؤٹ تھا۔

پورے گراؤنڈ میں ایک سنسنی اور سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ اب آخری دو گیندیں تھیں اور پانچ رنز باقی تھے۔ جبکہ کریز پہ آج کا مردِ میدان، سب کی امیدوں کا محور شعیب احمد کھڑا تھا۔

مخالف ٹیم کے سرکردہ کھلاڑیوں نے بڑی دیر مشاورت کی۔ فیلڈنگ بار بار تبدیل کی۔ بالآخر باؤلر نے دوڑ لگائی۔ گیند پھینکی۔ گیند ہاتھوں سے نکلتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کدھر جائے گی۔ شعیب احمد نے مخالف ٹیم کی باؤلنگ لائن اپ اس طرح تہس نہس کر دی تھی کہ اتنی اہم گیند باؤلر نے وائیڈ پھینک دی تھی۔ معاشیات کی ٹیم کا سفر ایک قدم مزید آسان ہو گیا تھا۔

پانچویں گیند پھینکنے کے لیے باؤلر نے دوڑ لگائی۔ اچھی گیند تھی مگر شعیب احمد کے لیے اب کرکٹ بال جیسے فٹ بال بن گئی تھی۔ اس نے اپنا بلا گھمایا۔ گیند اور بلے کے ٹکرانے کی دل کش آواز گونجی۔ پورے گراؤنڈ میں جیسے شور و غل اور داد و تحسین سے محشر بپا ہوا۔ گیند ہوا میں بلند ہوئی۔ فضا کا سینہ چیرتی ہوئی، زمین پہ اپنی طرف نظریں جما کر دیکھنے والوں کو ناز و ادا سے دیکھتی ہوئی مڈ وکٹ کے اوپر سے پرواز کرتی ہوئی تماشائیوں کے درمیان جا کر گری۔ گیند بلند ہوتے ہی شعیب احمد نے فاتحانہ انداز میں اپنا بلا لہرایا تھا۔ اس کے ساتھی کھلاڑی جوشِ مسرت سے والہانہ انداز میں گراؤنڈ کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ یہ میچ اس نے تن تنہا ایک گیند قبل ہی جتوا دیا تھا۔ اس کی ٹیم سیمی فائنل کے لیے کوالی فائی کر چکی تھی۔

اس کے ساتھی کھلاڑیوں نے اسے کندھوں پہ اٹھایا۔ تماشائیوں نے نعروں اور تحسین کی آوازوں سے اپنی مسرتوں کا اظہار کیا۔ ان مسرتوں کے بیچ جنید رضا بھی پھیکی سی مسکراہٹ

کے ساتھ موجود تھا۔ وہ اپنی ٹیم کی جیت کی خوشی سے زیادہ شعیب احمد کی شاندار کارکردگی پہ جلا بھنا تھا۔ بہ ظاہر چہرے پہ خوشی اور جوش کا اشتہار سجائے ہوئے تھا مگر اندر ہی اندر غصے اور حسد سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

شعبۂ معاشیات کے طلبا و طالبات بڑے ہی خوش تھے۔ ان کی خوشی ان کے نعروں اور جوش و خروش سے عیاں تھی۔ شعیب احمد نے انہیں یقینی شکست کے دکھ سے نکال کے، ناقابلِ یقین جیت کی مسرتوں سے نہال کر دیا تھا۔

مسرتوں سے بھرے ان سب چہروں میں ایک چہرہ ایسا بھی تھا جس پہ خوشی اور جوش کے تاثرات چھپائے نہیں چھپ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کے ساتھ بھرپور محبت کے جذبات جیسے ہلکورے لے رہے تھے۔

وہ عالیہ تھی۔ وہ ایسا رس بھرا انار تھی، شعیب احمد اور ٹیم کپتان جنید رضا اس کے بیمار تھے۔ اسی انارکلی کی وجہ سے جنید رضا اپنی ٹیم کی جیت کی خوشی کی بجائے شعیب احمد کی کارکردگی پہ رقابت محسوس کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

شعیب احمد کا یونی ورسٹی میں تیسرا سمسٹر تھا۔ اس کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ اس کا باپ ایک سرکاری محکمے میں چھوٹا سا ملازم تھا۔ ہر باپ کی طرح اس کی بھی تمنا تھی کہ اس کا بیٹا اچھا لکھ پڑھ کے، اچھی سی نوکری حاصل کر سکے۔

ویسے تو دانشور لوگ بڑی بڑی کتابی باتیں کرتے ہیں کہ تعلیم حاصل کرنے کے فلاں فلاں فائدے ہیں مگر غریب اور متوسط طبقے کے لوگ اپنی اولاد کو کسی فلاں فلاں فائدے کے لیے نہیں، بس ایک اچھی سی سرکاری نوکری مل جائے، اس مقصد سے تعلیم دلواتے ہیں۔

شعیب احمد شریف اور قابل نوجوان تھا۔ یونی ورسٹی میں پہلا سمسٹر کیسے گزر گیا وہ سمجھ ہی نہ سکا۔ ماحول کو سمجھتے سمجھتے چھ مہینے اتنی تیزی سے گزر گئے کہ وہ کلاس روم، پروفیسرز اور اپنی پڑھائی کے علاوہ کسی اور چیز پہ دھیان ہی نہ دے سکا۔

دوسرا سمسٹر شروع ہوا تو اس میں خود اعتمادی بھی آ گئی۔ اب وہ جان گیا کہ کتابوں کے علاوہ بھی یونی ورسٹی میں دل بہلانے کے ہزار رنگ ڈھنگ ہیں۔ اس نے دوست بھی بنائے، کتابوں کے ساتھ ساتھ خوش جمال لڑکیوں کے کتابی چہرے بھی پڑھنے شروع کیے۔ پروفیسرز کے لیکچرز کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ بھی لینے لگا۔ اس سب کے ساتھ ساتھ چپکے چپکے ایک شوخ ادا حسینہ کی محبت کا اسیر بھی بن گیا۔ لیکن مجال ہے جو کبھی تمنائے دل کا اُس کے آگے اظہار کیا ہو۔ وہ لڑکی ہمیشہ اگلی نشستوں پہ دائیں جانب بیٹھا کرتی تھی۔ شعیب احمد اس کے بائیں جانب اک ذرا پیچھے بیٹھ جاتا۔ کلاس کے دوران بس چپکے چپکے کن انکھیوں سے اسے تکا کرتا۔

اس کا نام عالیہ تھا۔ اس کا لباس، حلیہ اور آن بان غمازی کرتی تھی کہ اس کا نام ہی نہیں، حقیقت میں بھی کسی عالی جناب کی بیٹی تھی۔ شعیب احمد نے کئی بار اسے یونی ورسٹی آتے جاتے دیکھا تھا۔ وہ بڑی سی گاڑی میں آتی تھی۔ گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ ایک گن مین بھی ہوتا تھا۔ اسے یونی ورسٹی چھوڑ کے وہ واپس چلے جاتے تھے۔ چھٹی کے وقت اسے لینے آتے تھے۔

چند ہی دنوں میں اسے معلوم ہوا کہ وہ شہر کے ایک امیر کبیر بزنس مین وقار علی خان کی بیٹی تھی۔ کچھ تو اس کا رعبِ حسن تھا، کچھ اس کی خاندانی شان و شوکت کا اثر تھا کہ شعیب احمد کے دل میں پھوٹنے والے محبت کے چشمے اندر ہی اندر ابلتے رہے۔ باہر نکل کر گلشن حسن کو سیراب کرنے سے قاصر رہے۔

دوسرا سمسٹر ختم ہوتے ہوتے بات بس اتنی سی آگے بڑھی کہ شعیب احمد اس قاتلِ جاں سے رسمی گفتگو کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ اس کے پیچھے ایک وجہ تھی۔

عالیہ جنون کی حد تک کرکٹ کو پسند کرتی تھی۔ وہ خود بھی کرکٹ کھیلتی تھی۔ یونی ورسٹی میں لڑکیوں کی کرکٹ ٹیم نہیں تھی۔ یہ الگ بات ہے عالیہ نے لڑکیوں کی ٹیم بنانے کی کوشش کی تھی لیکن ایک مذہبی جماعت کے لڑکوں نے خطرناک دھمکیاں دے کے اسے ناکام بنا دیا۔ اس جماعت کے لڑکوں نے یونی ورسٹی میں زبردست احتجاج کیا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی سرکاری یونی ورسٹی میں لڑکیاں ٹریک سوٹ میں کرکٹ کھیلیں، یہ بات ان کے لیے قابل برداشت نہیں تھی۔ ان کی مذہبی اور ایمانی غیرت کے لیے چیلنج کی بات تھی۔ اس لیے انہوں نے ایمانی جذبے کا ڈھول پیٹ پیٹ کے عالیہ کے شوق اور کوششوں کا گلا گھونٹ دیا۔ یونی ورسٹی انتظامیہ بھی اس مذہبی جماعت کی دھونس میں آ گئی۔

وہ بڑے گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے پاس کھیلنے کے دیگر مواقع موجود تھے۔ سٹی کرکٹ کلب میں وہ اکثر اونچی سوسائٹی کے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ کرکٹ سے اسی تعلق کی وجہ سے وہ شعیب احمد کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

شعیب احمد اپنے ڈیپارٹمنٹ کی کرکٹ ٹیم میں منتخب ہوا تھا۔ انٹر ڈپارٹمنٹ مقابلوں میں اس نے اچھی کارکردگی دکھائی تھی۔ وہ مضبوط اور کسرتی جسم کا تھا۔ خوش شکل تھا۔ بہت سے لڑکوں میں نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے کرکٹ میں بھی اچھی کارکردگی دکھائی تو عالیہ کی نظروں میں ٹھہر گیا۔

شعیب احمد اسے پہلے ہی دل میں سمائے ہوئے تھا مگر مجال گویائی محال تھی۔ اب جب عالیہ خود اس کے قریب آ گئی۔ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کی بیٹنگ کی تعریف کرنے لگی تو

دل کا مرجھایا چمن جیسے کھل اٹھا۔ اسے کرکٹ میں مہارت کی مسرت شاید پہلے اتنی نہیں ہوئی تھی جتنی عالیہ کی تعریف کے بعد ہونے لگی۔

تیسرا سمسٹر شروع ہوا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیاں بھی نئے انداز سے شروع ہوگئیں۔ اکنامکس ڈپارٹمنٹ کی کرکٹ ٹیم میں چند تبدیلیاں کی گئیں۔ ٹیم کا کپتان یونی ورسٹی چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ نائب کپتان جنید رضا نام کا کھلاڑی تھا۔ یہ لڑکا اتنا بڑا کھلاڑی نہیں تھا جتنا اس کا اثر و رسوخ تھا۔ ڈیپارٹمنٹ کی مینجمنٹ نے اسے کپتان بنایا تو بہت سوں کو حیرت ہوئی تھی۔

جنید رضا ایک سیاست دان کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ علاقے کا ایم این اے تھا۔ وہ بڑا ہی مغرور اور بد مزاج لڑکا تھا۔ وہ شروع دن سے شعیب احمد کو ناپسند کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ الیکشن کے دنوں میں شعیب احمد نے جنید رضا کے ڈیڈی صفدر رضا کے مخالف امیدوار کی کمپیئن کی تھی۔ الیکشن کے دنوں میں ان دونوں کا کئی بار جھگڑا بھی ہوا تھا۔ یہ غصہ اور کینہ وہ اپنے دل میں دبائے ہوئے تھا۔ جب ڈپارٹمنٹ کی ٹیم کا کپتان بن گیا تو شعیب احمد سے بدلہ لینے کا موقع بھی مل گیا۔ اس نے کئی مقابلوں میں شعیب احمد کو نظر انداز کر کے کمزور لڑکوں کو کھلایا۔ شعیب احمد شریف بھی تھا، غریب بھی۔ یونی ورسٹی میں بھی جنید رضا جیسا اثر و رسوخ نہیں تھا۔ اس لیے دل میں کڑھتا ہوا بنچوں پہ بیٹھا رہتا۔

سیاسی اختلاف کے علاوہ ناپسندیدگی کی ایک وجہ رقابت بھی تھی۔ وہ دونوں عالیہ کے چاہنے والوں میں تھے۔ عالیہ اور جنید رضا اونچے گھرانوں کے بچے تھے۔ ایک کا باپ بزنس ٹائیکون تھا۔ دوسرے کا سیاسی اشرافیہ سے تعلق تھا۔ ان دونوں کے سامنے بے چارے شعیب احمد کی کچھ حیثیت ہی نہیں تھی۔

جنید رضا اور عالیہ اکثر ایک ساتھ دکھائی دیتے تھے۔ کلاس روم سے باہر کبھی کیفے ٹیریا میں، کبھی سبزہ زار میں اور کبھی کسی راہداری میں وہ دونوں اکٹھے نظر آتے تھے۔ کبھی اپنے گروپ کے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ اور کبھی وہ دونوں تنہا ہی۔ شعیب احمد ان دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ کر رقابت سے جل بھن جاتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا عالیہ اور جنید کے درمیان کیسا رشتہ ہے؟ کیا محض دوستی ہے یا پھر محبت کا کوئی جذبہ بھی ان کے بیچ پنپ رہا ہے؟

اپنی کم تر سماجی حیثیت کی بدولت وہ آگے بڑھ کر عالیہ کے آگے دل کا حال بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے دل میں محبت کا ٹھاٹھیں مارتا دریا ہونے کے باوجود، زبان پیاسی تھی۔ عالیہ سے پیار کا اقرار اس کے لیے ناقابل اظہار تھا۔

☆......☆......☆

ایک دن عجیب بات ہوئی۔ شعیب احمد لائبریری میں بیٹھا کچھ نوٹس بنا رہا تھا۔ اس کے سامنے میز پہ دو تین موٹی موٹی کتابیں دھری ہوئی تھیں۔ وہ ان میں دیکھ دیکھ کر اسائنمنٹ لکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے محسوس کیا کوئی اس کے قریب کھڑا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر ایک دم چونک اٹھا۔ اس کے سامنے عالیہ کھڑی تھی۔

وہ نرم سے لہجے میں بولی۔ ”آپ بہت مصروف لگتے ہیں۔ اگر پانچ منٹ کے لیے یہاں بیٹھ کر آپ سے بات کر لوں تو برا نہیں لگے گا نا؟“

”جج......جی، تشریف رکھیے۔“ وہ گڑبڑا کر بولا۔

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ شعیب احمد اس کی قربت کے شبنمی احساس سے بھیگ گیا۔ اتنے عرصے میں پہلی بار وہ اکیلے میں اس کے قریب آ کے بیٹھ گئی تھی۔ اس سے بات کر رہی تھی۔ وہ بولی۔ ”میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔ اگر آپ

مان گئے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

اس نے ہمت کر کے کہا۔"اتنے پُر تکلف انداز میں بات کر کے آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔آپ حکم کریں۔میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

وہ خوش دلی سے بولی۔"سال بھر سے ہم ایک ساتھ پڑھتے آئے ہیں لیکن دور دور رہے ہیں۔اس وجہ سے کچھ تکلف جیسا انداز بیچ میں آگیا تھا۔ورنہ میں خود ایسی باتیں پسند نہیں کرتی۔"

اس نے کہا۔"آپ کا تعلق اونچی سوسائٹی سے ہے۔آپ کے تعلقات بھی اپنے جیسے لڑکوں سے ہوتے ہیں۔ایسے میں مجھ جیسے فقیر آپ سے دور دور ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔آپ دوری ختم کر کے میرے پاس آئی ہیں۔میں اپنے لیے اعزاز سمجھتا ہوں۔"

عالیہ مسکرا کے بولی۔"مجھے کرکٹ کا کریز ہے۔اسی ناتے آپ سے بھی دلچسپی رہی ہے۔اس وقت آپ کے پاس ایسی ہی وجہ سے آئی ہوں۔یونی ورسٹی کے باہر ہماری ایک سماجی تنظیم ہے۔جو کہ ٹرانس جینڈر اور ڈس ایبل کمیونٹیز کی ویلفیئر کے لیے کام کرتی ہے۔میں اس تنظیم کی جنرل سیکریٹری ہوں۔اس دفعہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک چیریٹی کرکٹ میچ کا انعقاد کریں۔یہ میچ سٹی کرکٹ کلب کے گراؤنڈ میں کھیلا جائے گا۔"

شعیب احمد نے پوچھا۔"اس چیریٹی میچ سے کیسا مالی فائدہ ہوگا؟ کیا میچ دیکھنے والوں کے لیے ٹکٹ ہوگی؟"

"نہیں۔ٹکٹ کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ہم نے خصوصی طور پر شہر کی نمایاں سیاسی اور سماجی شخصیات کو مدعو کیا ہے۔کرکٹ میچ کے دوران سٹیج سے بار بار انہیں ترغیب دی جائے گی کہ ہماری تنظیم کے لیے مالی تعاون کریں۔میچ کے دوران بھی مالی مدد کرنا چاہیں تو ہمارے

نمائندے بکس لے کران کے پاس جائیں گے۔اعلان کر کے بعد میں بھی دینا چاہیں توان کی مرضی ہوگی۔"

"آپ کا ارادہ بڑا نیک ہے۔آپ کے کسی کام آ کر مجھے بڑی خوشی ہوگی لیکن میرا کردار کیا ہوگا؟"

وہ بولی۔"چیریٹی کرکٹ میچ کی ایک ٹیم میں آپ کا نام بھی شامل ہے۔اس سلسلے میں آپ کی رضامندی مجھے چاہیے۔"

"زہے نصیب! یہ تو میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ایک طرف ایک بڑا مقصد ہے۔ دوسری طرف کرکٹ میرا شوق بھی ہے۔ایسے میں مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔"

"شکریہ! اس اتوار کی صبح دس بجے سٹی کرکٹ کلب کے گراؤنڈ میں آجائیں۔باقی تفصیلات وہیں پہ بتادوں گی۔"

وہ اٹھنے لگی تو شعیب احمد نے کہا۔"یونی ورسٹی سے دوسرے لڑکے بھی ہوں گے۔کیا جنید رضا بھی شامل ہوگا؟"

وہ بولی۔"جنید رضا ابھی تک یونی ورسٹی نہیں آیا ہے۔اس کا نام بھی شامل ہے۔یونی ورسٹی کے چند دوسرے لڑکے بھی ہیں۔باقی پلیئرز میں ہماری تنظیم کے لڑکے لڑکیاں ہیں۔ٹرانس جینڈر کمیونٹی کے بھی چند کھلاڑی ہیں۔"

وہ لائبریری سے باہر چلی گئی۔شعیب احمد دل میں میٹھے میٹھے جذبوں کے لمس محسوس کرتے ہوئے، پھر سے نوٹس بنانے لگا لیکن اب اس کا ارتکازِ فکر بری طرح متاثر ہوا تھا۔عالیہ نے پہلی بار، اس کے قریب آ کر، اس سے ہم کلام ہوکر، دل کی پُرسکون جھیل کو متلاطم کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

جنید رضا نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں تمہاری تنظیم زبردست سماجی کام کر رہی ہے۔ چیریٹی کرکٹ میچ کا آئیڈیا بھی بڑا شاندار ہے۔ یونی ورسٹی سے اور کون اس میں کھیل رہے ہیں؟“

وہ بولی۔ ”ہمارے ڈپارٹمنٹ سے تم اور شعیب ہیں۔ دوسرے ڈپارٹمنٹس کے چار پانچ لڑکے اور بھی ہیں۔“

جنید رضا کی پیشانی پہ شکنوں کا جال سا بُن گیا۔ وہ سرد لہجے میں بولا۔ ”شعیب کو شامل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ڈھنگ سے بیٹ پکڑنا نہیں آتا اسے۔ وہ کیا خاک اپنے کھیل سے کسی کو متاثر کرے گا۔“

”اس بے چارے کو اب اتنا بھی حقیر مت سمجھو یار! وہ تمہاری ٹیم کا اہم ممبر ہے۔ وہ اچھی کرکٹ کھیلتا ہے۔“

وہ ناگواری سے بولا۔ ”ہمارے ڈپارٹمنٹ میں کوئی اور اچھا کھلاڑی نہیں مل رہا۔ اس لیے مجبوراً اسے شامل کیا ہے۔ ویسے بھی وہ ہمیشہ بارہویں کھلاڑی کے طور پر شامل کیا جاتا ہے۔“

عالیہ ہنستی ہوئی بولی۔ ”میں جانتی ہوں تم اس سے کچھ بیر رکھتے ہو۔ میں وجہ نہیں جانتی ہوں مگر اس بے چارے کے ساتھ اکثر ناانصافی کرتے ہو۔ اپنے کپتان ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہو۔“

اس نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”اس کی وکالت مت کرو۔ میں بڑا صاف گو ہوں۔ جو مجھے پسند نہیں اس کا کھلم کھلا اظہار کرتا ہوں۔ شعیب بھی مجھے زہر لگتا ہے۔ اس لیے میں صاف صاف کہتا ہوں اگر وہ چیریٹی میچ میں کھیلا تو میں نہیں آؤں گا۔“

عالیہ جانتی تھی وہ بڑا ہی منہ پھٹ اور تند مزاج تھا۔

اس نے ملائمت سے کہا۔ ”دیکھو! اس طرح ری ایکٹ مت کرو۔ میں نے اس سے بات

کی ہے۔اس نے رضامندی بھی دے دی ہے۔ایسے میں کس طرح اسے منع کروں؟ چلو تم کہتے ہو تو اسے مخالف ٹیم میں شامل کریں گے۔لیکن پلیز اپنی ضد سے باز آجاؤ۔''

''یہ میری ضد نہیں، میرا فیصلہ ہے۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔''اگر تمہیں منظور نہیں تو میری طرف سے معذرت قبول کرلو۔ویسے بھی اتوار کو میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے پہاڑوں پہ جارہا ہوں۔''

اس نے یہ کہا۔عالیہ کا جواب سنے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا دور ہوتا چلا گیا۔عالیہ دکھ، افسوس اور غصے کے ملے جلے احساسات کے ساتھ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

☆......☆......☆

اتوار کے دن سٹی کرکٹ کلب کے گراونڈ میں چیریٹی میچ کھیلا گیا۔عالیہ کی این جی او نے بڑے اچھے انتظامات کیے تھے۔بہت سے تماشائی یہ میچ دیکھنے آئے تھے۔عوام کے علاوہ خواص کی بھی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی تھی۔ڈس ایبل پرسنز اور خواجہ سرا کمیونٹی کی فلاح کے جس مقصد سے یہ میچ کھیلا گیا تھا، بہت حد تک اس میں کامیابی ہوئی تھی۔انہیں دل کھول کر چندہ دیا گیا تھا۔

دس دس اوورز کے اس میچ میں، اپنے ضدی فیصلے کے بموجب جنید رضا نے شرکت نہیں کی تھی۔عالیہ آخری لمحوں تک اس کا انتظار کرتی رہی تھی۔اس کا فون نمبر بھی مسلسل بند تھا۔جنید رضا کے اس عمل سے وہ بہت رنجیدہ اور مایوس ہوگئی تھی۔

شعیب احمد اگرچہ بہت کم عرصے کے لیے کریز پہ کھڑا رہ سکا تھا۔وہ صرف پندرہ گیندیں کھیل سکا تھا۔ان پندرہ گیندوں میں بھی اس نے 45 رنز بنائے تھے۔جس میں چار چھکے اور تین چوکے شامل تھے۔اس نے اپنے دل کش سٹروکس سے تماشائیوں کو بھرپور تفریح کا موقع

فراہم کیا تھا۔

کرکٹ کی زبان میں ٹرننگ پوائنٹ کی اصطلاح عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔ شعیب احمد کی زندگی میں بھی، یہ چیریٹی میچ ایک طرح سے ٹرننگ پوائنٹ کی شکل اختیار کر گیا۔

اس چیریٹی میچ کے بعد عالیہ اس کے قریب آ گئی۔ اس کی نوازشات اور تعلقات میں ایک گرم جوشی پیدا ہو گئی۔ پہلے وہ محض ایک کلاس فیلو تھی۔ رسمی ہیلو ہائے یا پُر تکلف مسکراہٹوں تک بات محدود تھی۔ اب اس کے برتاؤ میں ایک بے ساختگی اور خلوص جھلکنے لگا تھا۔

شعیب احمد جیسے پھر سے جی اٹھا تھا۔ پہلے اس کی زندگی میں حسرتیں تھیں۔ اب عالیہ کی قربت کی مسرتیں تھیں۔ پہلے اُس کی سماجی حیثیت کے باعث اپنی کمتری کا احساس ہوتا تھا، اب اُس کی بے تکلف صحبتوں کی وجہ سے اپنی خوش بختی کا احساس ہوتا تھا۔

☆......☆......☆

جنید رضا کی فطرت میں کینہ اور غصہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس کا باپ صفدر رضا گھاگ سیاست دان تھا۔ سیاست ایسا پیشہ ہے جس میں ظرف کشادہ رکھنا پڑتا ہے۔ قدم قدم پر تحمل کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے مگر وہ اپنی منتقم مزاجی اور تُند خوئی کی وجہ سے بڑا بدنام تھا۔ اس کی یہی فطرت، اس کے اکلوتے بیٹے میں بھی منتقل ہو گئی تھی۔ صفدر رضا تو اپنے تجربے اور پیشے کی وجہ سے برداشت بھی کرتا تھا۔ جنید رضا نوجوان تھا اس لیے فوراً ہتھے سے اکھڑ جاتا تھا۔ باپ کی طاقت اور سیاسی حیثیت کا غرور بھی دماغ میں اس طرح سمایا ہوا تھا کہ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا تھا۔

چیریٹی میچ کے بعد، دن گزرتے ساتھ عالیہ جب اس سے پہلو بچانے لگی۔ اس سے دور دور رہنے لگی اور شعیب احمد کے ساتھ زیادہ نظر آنے لگی تو وہ کھٹک گیا۔ ایک دن موقع پا کر

پوچھ لیا۔ ”عالیہ! میں دیکھ رہا ہوں تم مجھ سے کھنچی کھنچی رہنے لگی ہو۔ کیا یہ سب اس چیریٹی میچ میں شرکت نہ کرنے کی وجہ سے ہے؟“

وہ بے نیازی سے بولی۔ ”رشتے ناتے اعتماد کی بنیاد پر مستحکم ہوتے ہیں۔ تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ میں نے تم سے تعلق نہیں توڑا ہے۔ بس دل کھٹا ہو گیا ہے۔“

وہ شاکی لہجے میں بولا۔ ”تم نے بھی تو میرے جذبات کی قدر نہیں کی تھی۔ کیا اُس شعیب احمد کے نہ کھیلنے سے چیریٹی میچ پہ اثر پڑتا؟ وہ ایسا مشہور کھلاڑی تو نہیں کہ جس کے لیے تم نے میری خواہش کا احترام نہیں کیا۔“

”میں نے پہلے اس سے بات کی تھی۔ اخلاقی طور پر میں پابند تھی۔ وضع داری بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔“

وہ ناگواری سے کہنے لگا۔ ”وہ کون سا گورنر کا بیٹا ہے؟ اس کی حیثیت کیا ہے جو اس کی ناراضی کے خوف سے تم نے میری بات ٹھکرائی؟“

عالیہ متانت سے بولی۔ ”میری بات سنو جنید! مجھے مت سمجھاؤ کہ گورنر کے بیٹے اور ایک عام شخص کے بیٹے سے کس طرح تعلق رکھنا ہے؟ میں سمجھتی ہوں شعیب احمد کو چیریٹی میچ میں کھلا کے کچھ غلط نہیں کیا ہے۔“

وہ غصے سے بولا۔ ”تم میری انسلٹ کر رہی ہو عالیہ! اس دو ٹکے کے لڑکے کے لیے میری بے عزتی کر رہی ہو۔ میں ایسی باتیں برداشت کرنے کا عادی نہیں۔“

عالیہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ”میں کسی کی انسلٹ نہیں کر رہی ہوں۔ میں انسانیت اور شرافت کی بات کر رہی ہوں۔ اسی بنیاد پر میں دوست بنانا پسند کرتی ہوں۔ اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو مجھے ایسی دوستی بھی پسند نہیں۔“

جنید رضا ایک دم بھڑک اٹھا۔ ہولے سے گرج کر بولا۔ ''تم اچھا نہیں کر رہی ہو عالیہ! میری دوستی ٹھکرا کر سکون سے نہیں رہ سکو گی۔ میں اس بدبخت شعیب احمد کو بھی دیکھ لوں گا۔ اس کی زندگی بھی اس کا کرکٹ کیریئر بھی برباد نہ کیا تو صفدر رضا کا بیٹا نہیں۔''

یہ کہہ کر وہ جھٹکے سے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے سامنے سے دور ہوتا چلا گیا۔ عالیہ اپنے دل میں امڈتے غصے کے دریا کو سنبھالتی، ہونٹ کاٹتی، اسے جاتے دیکھتی رہی۔ کچھ ناگفتنی اندیشے دل و دماغ میں لہریں مارتے رہے۔ وہ انہیں دباتی سر جھکائے سوچنے کے انداز میں چلتی ایک طرف جانے لگی۔

اسی وقت شعیب احمد ایک ستون کی آوٹ سے باہر نکلا۔ اس کی نظر اتفاقاً ان دونوں پر پڑی تھی۔ وہ دور تھا۔ ان کی باتیں سن نہیں سکتا تھا مگر اندازہ ہو رہا تھا ان میں کوئی گرما گرمی تھی۔ اس نے تجسس کی وجہ سے ایک ستون کے پیچھے کھڑے ہو کر انہیں غور سے دیکھا تھا۔ ان دونوں کے تیور صاف صاف بتا رہے تھے۔ وہ دونوں غصے میں تھے۔

☆......☆......☆

جنید رضا غصے سے بھرا ہوا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا پارکنگ ایریا کی طرف آیا۔ اپنی کار کا دروازہ کھول کے اندر بیٹھا۔ بڑے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ کار اسٹارٹ کر رہا تھا اسی وقت دوسرے دروازے کے شیشے کو کسی نے بجایا۔ اس نے دیکھا۔ دروازے پر اس کا دوست جعفر کھڑا تھا۔ یہ ڈپارٹمنٹ کی ٹیم کا ممبر تھا۔ جنید رضا کا دوست بھی تھا۔

جعفر دروازہ کھول کے سیٹ پہ بیٹھ گیا۔

''یار جنید! کیا مسئلہ ہے؟ تم اتنے غصے میں کیوں ہو؟''

جنید ہونٹ بھینچ کر بولا۔ ''اچھا ہوا تم مل گئے۔ میرے دماغ میں اس وقت لاوے پھٹ

رہے ہیں۔ جی چاہتا ہے سب کو جلا کر راکھ کردوں۔"
"وہ تو صاف پتا چل رہا ہے تمہارے اندر کیسی ہلچل مچی ہوئی ہے لیکن کچھ بتاؤ تو سہی۔ آخر کیا ماجرا ہوا ہے؟"

اس نے تیزی سے کار موڑ کے باہر جانے والے راستے پہ ڈال دی۔ پھر سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پہلے سگریٹ جلاؤ۔ میں کچھ کش لے کر نارمل ہو جاؤں گا تو بتادوں گا۔"

جعفر نے سگریٹ جلا کے اسے دے دیا۔ جنید نے ایک گہرا کش لے کر زہریلے لہجے میں کہا۔ "سالی! بہت ہواؤں میں اڑنے لگی ہے۔ جانتی نہیں مجھ سے بگاڑ پیدا کر کے کتنی بڑی غلطی کرنے والی ہے۔ اس کا ایسا حشر کردوں گا کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔"

جعفر سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا عالیہ نے کچھ کہا ہے؟ یہ مبارک کلمات اسی کے لیے ارشاد کیے جارہے ہیں؟"

"جی ہاں۔ اس کمینی نے دوٹوک انداز میں کہہ دیا ہے کہ دوستی ختم کررہی ہے۔ جانتے ہو یہ سب کس وجہ سے ہوا ہے؟ اس الو کے پٹھے شعیب احمد کی وجہ سے۔ اس کی ضد میں آ کر میں نے چیریٹی میچ میں حصہ نہیں لیا تھا اس کے ردعمل میں عالیہ کی بچی نے مجھ سے تعلق توڑنے کی دھمکی دے دی ہے۔"

"اس دھمکی کے پیچھے صرف چیریٹی میچ والا معاملہ ہے یا پھر شعیب احمد کا بھی کوئی کردار ہے؟"

جنید رضا نے نفرت سے شیشے سے باہر تھوکتے ہوئے کہا۔ "بات صرف چیریٹی میچ کی ہوتی تو میں برداشت کرلیتا۔ اس نے شعیب کی کھلم کھلا طرف داری کی ہے۔ میں نے اسے دو ٹکے کا کہا تو الٹا مجھے انسانیت اور شرافت کا بھاشن سنانے لگی۔ ساتھ ہی دوستی ختم کرنے کی دھمکی

دے دی۔ بس اسی بات پر میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔"

"پھر کیا سوچا ہے تم نے؟ عالیہ سے تعلق ختم کرنا ہے؟ شعیب احمد کو سبق سکھانا ہے؟"

"عالیہ سے تعلق ختم کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اس کے بارے میں بہت سنجیدہ ہوں یار۔ وہ میرے لیے بہت خاص ہو گئی ہے۔ رہی بات شعیب احمد کی اسے واقعی جھٹکا لگنا چاہیے۔"

جعفر نے کہا۔ "ٹیم میں تو وہ بے چارہ برائے نام ہے۔ تم کپتان ہو۔ اسے پہلے ہی کھیلنے کا موقع نہیں دے رہے ہو۔ اب کیا ٹیم سے ہی نکال دینے کا سوچا ہے؟"

"ایسا ممکن نہیں۔ ٹیم سے ایک دم نکال دینے میں مشکلات ہو سکتی ہیں۔ اس کی سزا یہی ہو گی کہ بنچوں پر ہی بیٹھا رہے گا۔ کبھی گراؤنڈ میں اتر کر کھیل نہیں سکے گا۔"

پلیئر پاور ہر دور میں ہر سطح کی کرکٹ میں اپنا اثر دکھاتی رہی ہے۔ ڈریسنگ روم سے لے کر میڈیا روم تک اس کی کہانیاں گونجتی رہتی ہیں۔ اسی پلیئر پاور کی وجہ سے مضبوط ٹیمیں زوال کا شکار ہوتی ہیں۔ اچھے اچھے کپتان اسی پلیئر پاور کی سیاست میں پڑ کر رسوا ہوئے ہیں۔

جنید رضا کے ساتھ بھی پلیئر پاور تھی۔ وہ خود بااثر باپ کا بیٹا تھا۔ یونی ورسٹی کے اندر اپنی دھونس اور دھن سے بڑے بڑے کام نکلواتا تھا۔ ٹیم کا کپتان بھی ایسے ہی اثرات سے بن گیا تھا۔

ٹیم کے آدھے سے زیادہ کھلاڑی اس کے دائرۂ اثر میں تھے۔ وہ انہیں دھونس اور دھن سے اپنے ساتھ جوڑے رکھتا تھا۔ اپنے باپ کی دولت اور حیثیت استعمال کر کے انہیں بڑی بڑی گاڑیوں میں گھماتا پھراتا اور عیاشیاں کراتا تھا۔

شعیب احمد جیسے کمزور سماجی حیثیت کے لڑکے بس برائے نام ٹیم میں تھے۔اس کے گروپ کے کھلاڑی کسی وجہ سے نہ کھیلتے تبھی ان کی باری آتی تھی۔ ورنہ بنچوں پر بیٹھے بیٹھے ہی یا پھر بارہویں کھلاڑی کی طرح پانی کی بوتل لے کر گراؤنڈ میں جاتے جاتے ہی حسرتیں پوری کر لیتے تھے۔

☆......☆......☆

راہداری کے ستون کی اوٹ سے نکل کر شعیب احمد فاصلہ رکھ کر عالیہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ پچھلے کچھ دنوں سے عالیہ اس کے قریب ہو گئی تھی۔ اس سے بے تکلفی سے ملتی تھی۔ کیفے ٹیریا میں بھی اس کے ساتھ وقت گزارتی تھی۔ ان باتوں سے شعیب احمد کی جھجک ختم ہو گئی تھی۔ وہ احساس کمتری کے خول سے نکل کر، خود اعتمادی کے ساتھ اس سے ملتا تھا۔

اس وقت بھی عالیہ، جنید رضا سے تو تکار کے بعد مضطرب انداز میں ایک طرف جانے لگی تو شعیب احمد نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے قدم تیز کر لیے۔ ڈپارٹمنٹ کے طویل کوریڈور میں ایک جگہ اس کے قریب جا کے آواز دی۔ وہ رک گئی۔

شعیب احمد نے کہا۔ ''میں کافی دیر سے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔ کیا اس حوالے سے مجھ سے بات کرنا پسند کریں گی؟''

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں کچھ ڈسٹرب ہوں۔ چلو، کیفے ٹیریا کی طرف جاتے ہیں۔ مجھے کافی کی طلب بھی ہو رہی ہے۔''

وہ دونوں کیفے ٹیریا میں آ گئے۔ بڑے سے ہال کی اکثر میزیں سٹوڈنٹس سے بھری ہوئی تھیں۔ ان کے شور و غل سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ دونوں کھلے لان میں

ایک خالی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ شعیب احمد جا کے کافی لے آیا۔ ایک کپ اسے دے دیا۔ دوسرے کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''ڈپارٹمنٹ کے سامنے میں نے اتفاقاً آپ کو اور جنید کو دیکھا تھا۔ میں نے سنا تو کچھ نہیں مگر اندازہ ہو رہا تھا کچھ تلخی گھلی ہوئی تھی باتوں میں۔ کیا میں پوچھنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ کیا معاملہ تھا؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''وہ بدمزاج بھی ہے مغرور بھی ہے۔ اپنے ایم این اے باپ کی دھونس استعمال کر کے سب پر اپنا رعب جماتا ہے۔ مجھ پر بھی اپنا اثر ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''وہ تو آپ کا اچھا دوست ہے۔ آخر ایسی کیا بات ہے کہ آپ کی مرضی کے خلاف آپ کو مجبور کر رہا ہے؟''

عالیہ نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''وہ تمہیں ناپسند کرتا ہے۔ مجھے بھی مجبور کر رہا تھا تم سے تعلق نہ رکھوں۔ خاص کر چیریٹی میچ میں تمہارے کھیلنے سے اسے سخت تکلیف ہوئی ہے۔''

شعیب احمد دکھ سے بولا۔ ''یہ تو میں جانتا ہوں وہ مجھے کتنا ناپسند کرتا ہے۔ اس کے پیچھے سیاسی وجوہات ہیں۔ وہ بڑا کینہ پرور ہے۔ الیکشن کے دنوں کے اختلافات کو دل پہ لیے بیٹھا ہے۔ اسی وجہ سے میرے ساتھ اس کا رویہ ہر وقت درشت رہا ہے۔ لیکن آپ نے ایسا کیوں کیا؟ میری وجہ سے اپنی دوستی خراب کیوں کی ہے؟''

''جنید رضا کے رویے سے میں شروع سے نالاں تھی۔ وہ ایک انا پرست اور خودغرض انسان ہے۔ چلو اچھا ہوا اس سے دوستی ختم ہوگئی۔''

''میں اس کے مزاج سے واقف ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے وہ ردعمل دکھائے گا۔ آپ کو تنگ

کرے گا۔“

وہ بولی۔”میں جانتی ہوں وہ انتقامی حربے استعمال کرے گا۔اس نے دھمکی بھی دی ہے۔مجھ سے زیادہ اس کی دھمکی تمہارے لیے تھی۔تم اپنی آنکھیں ذرا کھلی رکھو۔“

”میں بہت عرصے اس کی انتقامی کارروائیوں کے نشانے پر ہوں۔میری اچھی کارکردگی کے باوجود کئی میچز میں مجھے نہیں کھلاتا۔اس کے پاس کپتان کا اختیار بھی ہے۔پلیئر پاور بھی ہے۔ڈپارٹمنٹ کے بڑوں کو اپنے دباؤ میں رکھنے کا آپشن بھی ہے۔اب اس سے بڑھ کر میرے ساتھ کیا برا کرسکتا ہے؟“

وہ ایک طرف سوچنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے بولی۔”وہ کیا کرسکتا ہے؟ یہ جاننا ضروری ہے۔اس کے لیے لازمی ہے کہ اس کے ارادوں کو سمجھا جائے۔ایسا تبھی ممکن ہے جب اس کے قریب ہو جائیں۔میں اسے منالیتی ہوں۔اس سے دوبارہ دوستی استوار کرتی ہوں۔اس طرح میں جان سکوں گی کہ وہ تمہارے خلاف کیسے عزائم رکھتا ہے۔“

شعیب احمد بھنویں اچکاتے ہوئے بولا۔”ابھی آپ خود اس سے تعلق ٹوٹ جانے پر خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔پھر دوبارہ تعلق جوڑنے کی بات کرتی ہیں۔آخر آپ کیا کرنا چاہتی ہیں؟“

وہ کچھ دیر کافی کی پیالی سے اٹھتی بھاپ پہ نظریں جمائے دیکھتی رہی۔پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔”اس کمینے کے کینے سے بچنے کے لیے ہی اس سے دوستی کا ڈھونگ رچانا چاہتی ہوں۔میں اس سے دور ہو گئی تو جان نہیں سکوں گی وہ تمہارے خلاف کیسی چالیں چلے گا۔“

اس نے چونکتے ہوئے کہا۔”آپ کا مطلب ہے اس کے برے عزائم سے مجھے بچانے

کے لیے اس سے دوستی کریں گی۔ نہیں نہیں۔ آپ میرے لیے اپنے مزاج پر بوجھ نہ ڈالیں۔ میں اتنا بھی بے بس نہیں۔ اس کی سازشوں کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "تم اس کی فکر مت کرو۔ اتنا عرصہ اس کے ساتھ دوستی کا تعلق نبھاتی رہی ہوں۔ آئندہ بھی کسی اچھے مقصد کے لیے اسے برقرار رکھ سکتی ہوں۔"

شعیب احمد جذبوں کی پوری شدت سے بولا۔ "مس عالیہ! آپ بڑی مہربان ہیں۔ مجھے اس کے شر سے بچانے کے لیے آپ یہ سب کر رہی ہیں۔ میں اسے بھول نہیں سکوں گا۔"

وہ دھیرے سے ہنستی ہوئی بولی۔ "میں بھی یہی چاہتی ہوں تم کبھی مت بھولو۔ تمہاری شرافت اور کرکٹ میں تمہاری صلاحیت ایسی خوبیاں ہیں کہ تم سے دوستی کرتے ہوئے مجھے خوشی ہو رہی ہے۔"

شعیب احمد نے خوشیوں سے تمتماتے چہرے کے ساتھ کہا۔ "آپ جیسی شاندار لڑکی سے دوستی میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ مگر ایک ہی یونی ورسٹی میں، ہم دونوں سے کس طرح الگ الگ دوستی قائم رکھ سکیں گی؟"

"جنید کے ساتھ مجبوری کی دوستی ہے۔ میں کوشش کروں گی اس کی موجودگی میں تمہارے ساتھ زیادہ بے تکلف نہ ہو جاؤں۔ ضرورت کی حد تک بات کر لوں گی۔"

"بہت بہت شکریہ عالیہ صاحبہ! میں اس دوستی کو سب سے قیمتی انعام سمجھوں گا اپنے لیے۔"

وہ ہنسی۔ "پہلے دوستی کے آداب بھی سیکھ لو۔ یہ عالیہ صاحبہ اور آپ جیسے بھاری بھر کم القابات دوستی کی علامت تو نہیں ہوتے۔ جب جنید کا سامنا ہو اس وقت بے شک اس انداز میں بات کرو۔ دوسرے موقعوں پہ دوست کے لہجے میں بات کرو۔"

شعیب احمد گویا پھولے نہیں سما رہا تھا۔ عالیہ نے دوستی کی بات کر کے دامنِ دل کو لالہ زار بنا دیا تھا۔ وہ بڑے عرصے سے اس کی محبت کا قتیل تھا۔ آج اظہار تمنا کیے بغیر ہی، اُس جانِ تمنا نے نوازشات کی برسات کر دی تھی۔

اب یہ آئندہ وقت بتانے والا تھا کہ یہ دوستی محبت کے مراحل طے کر کے راحتِ جاں بن جانے والی تھی یا پھر ستم گری کی خوں رنگ داستان۔

☆......☆......☆

عالیہ سے ہوئی تکرار کے بعد جنید رضا دل ہی دل میں کھولتا رہا۔ عالیہ اور شعیب کے لیے خطرناک ارادے بناتا رہا۔ یونی ورسٹی میں عالیہ سے سامنا ہوا بھی تو کھنچا کھنچا رہا۔ وہ انا پرست تھا۔ مغرور تھا۔ دل میں عالیہ کے لیے چاہت کے جذبات ہونے کے باوجود، اس کی طرف پیش قدمی سے گریزاں رہا۔

عالیہ اُس کے مزاج سے آشنا تھی۔ یہ بھی جانتی تھی وہ ایسا انا پرست ہے کبھی دیواریں گرا کے آگے نہیں بڑھے گا۔ اُس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی خواہش عالیہ کو بھی نہیں تھی، مگر حالات کے پیشِ نظر وہ چاہتی تھی کہ جنید رضا سے فاصلے ختم ہو جائیں۔ تاکہ شعیب احمد کے خلاف اُس کے دل میں کوئی برے عزائم ہیں تو انہیں جان سکے۔

اسی نیت سے وہ خود آگ بڑھی۔ دن کا آخری لیکچر ختم ہوا تو سب لڑکے لڑکیاں کلاس روم سے باہر نکلے۔ عالیہ نے دل پہ جبر کر کے جنید رضا سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنی کار کی طرف جا رہا تھا۔ عالیہ تیز تیز اس کے قریب گئی۔

"جنید رضا! کیا مسئلہ ہے؟ تم مجھ سے اتنے کھنچے کھنچے کیوں ہو؟"

وہ بلند آواز میں بولا۔ "تم کتنی ظالم ہو، خود ہی دوستی ختم کرنے کی بات کی، اب خود ہی وجہ

بھی پوچھ رہی ہو۔"
اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "سوری یار! اس دن میں نے کچھ سخت باتیں کی تھیں۔ بعد میں مجھے خود اس کا احساس ہوا تھا۔"
وہ تمتماتے چہرے کے ساتھ بولا۔ "تم نے جب ایک دو ٹکے کے لڑکے کی خاطر میرا دل توڑ دیا تو میں بتا نہیں سکتا، تمہارے بارے میں کیسے کیسے برے خیالات میرے دل میں پیدا ہو گئے تھے۔ شکر ہے تم نے میری برداشت کا زیادہ امتحان نہیں لیا۔"
وہ سنجیدگی سے بولی۔ "تم مجھے ظالم کہتے ہو۔ اصل میں، میں خدا ترس بہت ہوں۔ کسی کے بارے میں بھی برا نہیں سوچتی۔ تم نے شعیب احمد کے بارے میں بازاری زبان استعمال کی تو مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ اس وجہ سے میں کچھ سخت بول پڑی تھی۔ ورنہ تمہارا اور شعیب کا مقام میرے لیے ایک جیسا نہیں۔ تم سے اتنی پرانی دوستی ہے۔ وہ بے چارہ تو بہت سے دوسرے لڑکوں کی طرح عام سا کلاس فیلو ہے۔ اسے ذرا سی توجہ دی تو اس کا مطلب نہیں کہ تمہارے برابر حیثیت دے دوں۔"
جنید رضا خوشی سے کھل اٹھا۔ دل میں اس کے لیے جو غبار تھا ایک دم تحلیل ہو گیا۔
وہ طمانیت سے بولا۔ "عالیہ! میں تمہارے بارے میں کچھ زیادہ ہی سوچنے لگا ہوں۔ شاید یہ دوستی سے آگے کا کوئی جذبہ ہے۔ اسی لیے تم نے شعیب احمد کو تھوڑی توجہ زیادہ دی تو مجھ سے برداشت نہ ہوئی۔ میں نے بھی الٹی سیدھی باتیں کہہ ڈالیں۔ جس کا مجھے بھی افسوس ہے۔"
عالیہ اس کے لہجے میں چھپے جذبوں کی گرمی نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "ہم اچھے دوست ہیں۔ اس سے آگے کون سا مرحلہ ہوتا ہے ابھی میں اس بارے میں نہیں سوچنا چاہتی۔

تم بھی اسے زیادہ سنجیدگی سے مت لو۔رہی بات شعیب احمد کی۔تمہارا اس کے ساتھ ذاتی مسئلہ ہے۔تم اسے ناپسند کرتے ہو۔اب کم از کم مجھے اس حد تک پابند تو نہ کرو کہ اس سے بالکل ہی تعلق ختم کروں۔وہ ہمارا سبجیکٹ میٹ ہے۔کرکٹ ٹیم کا کھلاڑی ہے۔کسی نہ کسی حوالے سے اس سے واسطہ تو پڑتا ہے۔"

جنید رضا گہری سانس لے کر بولا۔"میں تمہیں پابند نہیں کرتا ہوں۔اس کم بخت سے بے شک رابطہ رکھو۔اسے اپنی ٹیم ممبر کے طور پر میں خود بھی تو برداشت کر رہا ہوں۔بس میرے مقابلے میں اسے اہمیت مت دو۔یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

عالیہ نے اس کی بات سن دل ہی دل میں کہا۔"تمہارے شر سے شعیب کو محفوظ رکھنے کے لیے تمہیں برداشت کرنے پہ مجبور ہوں۔اسی مجبوری کے تحت تمہاری باتیں بھی مان لیتی ہوں۔بس ذرا سے حالات بہتر ہو جائیں پھر دیکھنا تمہیں کس طرح اپنے سائے سے بھی دور کرتی ہوں۔"

☆......☆......☆

انہی دنوں یونی ورسٹی میں سپورٹس گالا کا آغاز ہوا۔کئی طرح کے کھیلوں کا انعقاد ہو رہا تھا۔ان سب میں کرکٹ کے کھیل میں سبھی کو دلچسپی تھی۔یونی ورسٹی کے مختلف شعبوں کی دس ٹیمیں تشکیل دی گئی تھیں۔انہیں دو گروپس میں تقسیم کیا گیا تھا۔

اکنامکس کی ٹیم کا کپتان جنید رضا تھا۔اسے اپنی من مانی کرنے کا موقع مل گیا۔وہ ایسا خود سر تھا کہ ڈپارٹمنٹ کے بڑوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔اس نے پہلے تین میچوں میں شعیب احمد کو بالکل نہیں کھلایا۔اس کی جگہ ایسے لڑکوں کو کھیلنے کا موقع دیا جو بالکل ناکام رہے تھے۔اس کا نتیجہ یہ رہا کہ تین میں سے دو میچز میں اکنامکس ڈپارٹمنٹ کو شکست ہو گئی۔

اب سیمی فائنل میں کوالی فائی کرنے کے لیے آخری گروپ میچ جیتنا لازمی تھا۔ جنید رضا کا ارادہ اب بھی شعیب احمد کو کھلانے کا بالکل نہیں تھا۔ اس موقع پر عالیہ نے پس پردہ بڑا کردار ادا کیا۔ اس نے اکنامکس ڈپارٹمنٹ کے سٹوڈنٹس کو احتجاج کے لیے اکسایا۔ خود پس منظر میں رہ کر طلبا و طالبات کو اتنا متحرک کیا کہ آخری میچ سے ایک دن پہلے بہت سے سٹوڈنٹس نے شعبہ ٔمعاشیات کی سپورٹس کمیٹی اور کپتان جنید رضا کے سامنے آکر شدید احتجاج کیا۔ شعیب احمد کو نہ کھلانے کی صورت میں کھیلوں کی ساری سرگرمیوں سے بائیکاٹ کرنے کی دھمکی دے دی۔

جنید رضا کو توقع نہیں تھی کہ شعیب احمد کے لیے اس طرح احتجاج کیا جائے گا۔ وہ آگ بگولا ہو گیا۔ احتجاج کرنے والوں کے دباؤ میں آنے سے بالکل انکار کیا۔ لیکن ایچ او ڈی نے موقع کی نزاکت دیکھ کر خود مداخلت کی۔ ایک اور اتفاق یہ ہوا کہ چھٹے نمبر پہ کھیلنے والے کھلاڑی کی کمر میں تکلیف شروع ہوئی۔ اس نے کھیلنے سے معذوری ظاہر کی۔ اس لیے جنید رضا نے بادل ناخواستہ شعیب احمد کو فائنل الیون میں شامل کر لیا۔

اور شعیب احمد نے اس میچ میں ثابت کر دیا کہ وہ کتنا باصلاحیت کھلاڑی ہے۔ اس نے ایک یقینی شکست کو تنِ تنہا اپنی بلے بازی کی بدولت جیت میں بدل دیا۔ اپنی ٹیم کو سیمی فائنل تک پہنچا دیا۔

جنید رضا ایسا کم ظرف تھا کہ شعیب احمد کی کارکردگی پہ خوش ہونے کے بجائے دل ہی دل میں لعن طعن کرنے لگا۔ آئندہ اس کا راستہ روکنے کے لیے منصوبے بنانے لگا۔ ٹیم میں اس کے اعتماد کے جولڑکے موجود تھے، ان کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گیا۔

وہ بولا۔ ”تم سب جانتے ہو میں اُس الو کے پٹھے کی کارکردگی سے کتنی تکلیف میں ہوں۔

میں بالکل نہیں چاہتا وہ آئندہ ایسا کچھ کرے۔ مجھے اپنی ٹیم کا ہار جانا قبول ہے مگر اس کی کامیابی ہرگز گوارا نہیں۔ اسے ہر صورت روکنا ہے۔"

منصور نام کا ایک لڑکا بولا۔"اس بدبخت نے جس طرح کی شاندار کارکردگی دکھائی ہے اور پھر سٹوڈنٹس نے اس کے لیے جس طرح آواز بلند کی ہے اس کے بعد یہ تو ممکن نہیں کہ اسے ٹیم سے ڈراپ کر دیا جائے۔ اب کوئی دوسرا آپشن استعمال کرنا ہوگا۔"

جعفر نے جوش سے کہا۔"جنید رضا! ہم تمہارے راز دار دوست ہیں۔ تم بتاؤ اسے کیسے روکنا ہے؟ کیا سے غوا کر لیں؟ اس کے بازو اور ٹانگیں توڑ دیں؟"

جنید رضا سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے بولا۔"یہ آپشن بھی زیر غور ہے۔ اس سے پہلے میرے ذہن میں ایک اور آئیڈیا ہے۔ سیمی فائنل کے لیے امپائر انگلش ڈیپارٹمنٹ کا محسن بلال ہے۔ ہم اسے ٹارگٹ کرتے ہیں۔ پیسہ بھی پستول بھی اس کے سامنے رکھتے ہیں۔ وہ سمجھ دار ہے۔ امید ہے ہماری بات مانے گا۔"

منصور تحسین آمیز لہجے میں بولا۔"واہ جنید واہ! کیا خوب سوچا ہے۔ سیاست دان باپ کے ہونہار بیٹے ہو۔ ایسی چال سوچی ہے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

وہ سگریٹ کا کش لے کر اس کے مرغولوں پہ نظریں جما کر بولا۔"دعا کرو یہ حکمت عملی کامیاب رہے۔ اس بدبخت کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے میں آخری حد تک جانے کے لیے تیار ہوں۔"

☆......☆......☆

جنید رضا کی والدہ صفیہ خاتون کئی برسوں سے بیمار تھیں۔ انہیں جگر کا سرطان تھا۔ ان کے علاج کے لیے پیسہ، پانی کی طرح بہایا گیا تھا۔ انگریزی، یونانی اور روحانی، ہر طرح کا علاج

کرایا گیا۔ مگر ان کی بیماری ختم نہ ہوئی۔

ان دنوں ان کی حالت بہت خراب تھی۔ جنید رضا تین بیٹیوں کے بعد اکلوتا بیٹا تھا۔ دو بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ صفیہ خاتون بہت دنوں سے اصرار کر رہی تھیں کہ جنید رضا کی بھی شادی کی جائے۔ وہ مرنے سے پہلے اس کی دلہن گھر میں دیکھنا چاہتی تھیں۔ جنید رضا پہلے تو کافی بہانے بناتا رہا تھا لیکن ماں کی بگڑتی ہوئی حالت کے پیش نظر ہتھیار ڈال دیے۔

بہنوں نے اس سے پسند کی لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ اس کے دل میں ایک ہی لڑکی تھی۔ اس نے عالیہ کا نام بتا دیا۔

عالیہ کا والد وقار علی خان کاروباری دنیا کا بڑا نام تھا۔ ایک طرح سے رئیل اسٹیٹ کا ٹائیکون تھا۔ جنید رضا کا ایم این اے باپ صفدر رضا اسے بخوبی جانتا تھا۔ اسے اطمینان ہوا کہ اس کے بیٹے نے جس لڑکی کو پسند کیا ہے وہ کسی فلمی کہانی کی طرح غریب گھرانے کی لڑکی نہیں۔ جس کے لیے بیٹا اپنے، اونچی حیثیت کے باپ سے بغاوت کرتا ہے۔

اسی شام وہ اپنی بیٹیوں کو لے کر وقار علی خان کے بنگلے میں پہنچ گیا۔ رسمی گفتگو کے بعد مدعا زبان پہ لے آیا۔ عالیہ اس وقت گھر میں نہیں تھی۔ اس کی امی اور ابو نے بہت خوش دلی سے ان کی بات سنی۔ بڑی عزت اور تکریم سے پیش آئے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ عالیہ سے پوچھ کر دو چار دنوں میں جواب دے دیں گے۔

اس رات عالیہ کی امی نے ساری بات بتا کے اس کی مرضی پوچھی۔ وہ جانتی تھی جنید رضا کی آنکھوں میں، اس کی باتوں میں ایک کلاس فیلو سے دوستی کا ہی جذبہ موجود نہیں ہوتا تھا، محبت کے احساسات بھی موجزن ہوتے تھے۔ لیکن ماں کی زبانی رشتے کے پیغام کی بات سن کر اسے دھچکا لگا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا جنید رضا اس حد تک پیش قدمی کرے گا کہ ہاتھ مانگنے کے لیے

اپنے گھر والوں کو بھیج دے گا۔

ماں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ جنید رضا کی ممی شدید علیل ہے۔اس کی آخری خواہش کے احترام میں اتنی عجلت میں رشتے کی بات کی گئی تھی۔

عالیہ سخت کشمکش میں مبتلا ہو گئی تھی۔اپنی ماں کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے گھر والے اِس رشتے سے خوش تھے مگر وہ خوش نہیں تھی۔اس نے جنید رضا کو یونی ورسٹی کے ایک ساتھی کے طور پر ہی بہت مشکل سے برداشت کیا تھا۔اب جیون ساتھی کے طور پر اسے قبول کرنا نہایت مشکل فیصلہ تھا۔

وہ جنید رضا کے رویے سے نالاں تھی۔اس میں خودسری تھی۔تند خوئی تھی۔گھمنڈ تھا جبکہ عالیہ بڑی نرم مزاج اور مہربان طبیعت کی مالک تھی۔پچھلے کچھ عرصے سے وہ جنید رضا سے فاصلے بڑھانے کی کوشش میں تھی۔اس کے پیچھے جہاں جنید رضا کی شخصیت کے ناپسندیدہ رویے تھے وہاں شعیب احمد کی متاثر کن شخصیت کی خوبیاں بھی تھیں۔اس کی شرافت، وجاہت اور کرکٹ کی صلاحیت نے عالیہ کو ذہنی اور دلی طور پر اس کے قریب کر دیا تھا۔خاص کر کوارٹر فائنل کے میچ میں اس نے جس طرح کی بیٹنگ کی تھی، عالیہ کے جیسے دل میں گھر کر گیا تھا۔

ان دنوں سب سیمی فائنل میچ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔عالیہ بھی شعیب احمد کی وجہ سے اسی میچ کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ سیمی فائنل سے قبل،اس کی زندگی کے پُرسکون تالاب میں جنید رضا تلاطم برپا کرے گا۔

اس رات جب اس کی امی نے اس سے مرضی پوچھی تو پہلا ردعمل اس کا انکار میں تھا۔

اس نے کہا۔"امی! جنید رضا کو میں دو سالوں سے جانتی ہوں۔اس سے دوستی کا ایک جیسا

تیسا تعلق بھی ہے۔اسی بنیاد پر میں سمجھتی ہوں وہ یونی ورسٹی کی حد تک تو دوستی کے لیے بس ٹھیک ہے مگر زندگی بھر کے ساتھی کے طور پر بالکل نامناسب ہے۔"

اس کی امی بولیں۔"بیٹی! تم سمجھدار ہو۔تمہاری پسند ہمارے لیے بہت اہم ہے۔اس کے باوجود میں کہتی ہوں تم ایک دم فیصلہ مت سناؤ۔تمہارے ابو اس رشتے سے بہت خوش ہیں۔ اس لیے تم چند دن غور کر لو۔اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔کیا پتا اس رشتے میں کوئی خیر ہو۔"

عالیہ کے دل نے ویسے تو حتمی فیصلہ سنا دیا تھا لیکن ماں کی بات کا احترام کرتے ہوئے اس نے یہ مان لیا کہ چند دن وہ مزید سوچ لے گی۔

سیانے کہتے ہیں رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں۔اس میں تقدیر کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ تھا ان دونوں کا رشتہ جوڑنے کے لیے کوئی تدبیر کامیاب ہونے والی تھی یا پھر تقدیر میں کچھ اور لکھا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

سیمی فائنل لائن اپ مکمل ہو گئی تھی۔اکنامکس ڈپارٹمنٹ کا مقابلہ پولیٹیکل سائنس ڈپارٹمنٹ کے ساتھ ہونے والا تھا،شعیب احمد اس میچ کو لے کر بڑا پُر جوش تھا۔وہ بھرپور فارم میں تھا۔اسے یہ اندیشہ بھی تھا کہ جنید رضا کینہ توزی کی وجہ سے اسے ڈراپ کرنے کی کوئی سازش بھی کر سکتا تھا۔وہ نہیں جانتا تھا جنید رضا واقعی سازشی حربہ استعمال کر رہا تھا۔یہ ایسی سازش تھی جس کے تحت اسے میچ میں کھیلنے کا موقع دے کر امپائر کے ذریعے ناکام کرانا تھا۔ یوں جنید رضا پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔

سیمی فائنل کا ٹاس جنید رضا جیت گیا۔اس نے خود پہلے بیٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔اوپنرز کی اچھی بلے بازی کے باعث پہلے دس اوورز میں دو وکٹوں کے نقصان پر 95 رنز بن گئے۔اگلے

تین اوورز میں مزید دو کھلاڑی آؤٹ ہو گئے۔ کپتان جنید رضا محض پانچ رنز بنا سکا۔

جب چوتھا کھلاڑی بھی آؤٹ ہوا تو تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرے گراؤنڈ میں شعیب، شعیب کی آوازیں گونجنے لگیں۔ سب چاہتے تھے شعیب احمد میدان میں آجائے اور کوارٹر فائنل جیسی دھماکے دار بلے بازی کا مظاہرہ کرے۔

کپتان جنید رضا نے بھی شعیب احمد کو بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ وہ مطمئن تھا کہ سازش کے مطابق امپائر محسن بلال اسے زیادہ دیر ٹھہرنے نہیں دے گا۔ دو کھلاڑی لگاتار آؤٹ ہونے سے پریشر بھی بڑھ گیا تھا۔

شعیب احمد دھڑکتے دل کے ساتھ اور سپورٹرز کے نعروں کی آوازوں کے ساتھ میدان میں آگیا۔ اس نے پہلی دو گیندیں سیدھے بیٹ سے دفاعی انداز میں کھیلیں۔ تیسری گیند پہ ایک رن بنا سکا۔ اگلے اوور کی پہلی گیند دوسرے کھلاڑی نے کھیل کر اسے بیٹنگ کا موقع دیا۔ شعیب احمد نے اس گیند کو مڈ آن کی طرف تیز کھیلا۔ فیلڈر نے پکڑنے کی کوشش کی، لیکن گینداس کے قریب سے چار رنز کے لیے نکل گئی۔ دوسری گیند فل ٹاس تھی۔ اسے باؤلر کے سر کے اوپر سے چھ رنز کے لیے کھیلا۔ پندرہویں اوور کی آخری گیند پر ایک رن بنا کے اگلے اوور کے لیے سٹرائیک اپنے پاس ہی رکھی۔

تماشائی اس کی گزشتہ اننگ نہیں بھولے تھے انہیں ایک اور شاندار بلے بازی کی امید تھی۔ ابھی تک چھ گیندیں کھیل کر 15 رنز بنا کے شعیب احمد نے ایک طرح سے اپنے جارحانہ عزائم کی جھلک دکھلا دی تھی۔

گراؤنڈ سے باہر جنید رضا دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وہ سلگتی نظروں سے شعیب احمد کو بیٹنگ کرتے دیکھ رہا تھا۔ اسے بے تابی سے کسی ایسی گیند کا انتظار تھا جو شعیب کے پیڈ

سے ٹکرائے یا پھر بلے کے پاس سے گزر کر وکٹ کیپر کے ہاتھوں میں چلی جائے۔ دونوں صورتوں میں شعیب احمد کا آؤٹ قرار دیا جانا یقینی تھا۔ کیوں کہ انہیں امپائر محسن بلال پر بھروسہ تھا۔ ابھی تک کھیلی گئی چھ گیندوں میں شعیب احمد نے ایسا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔

سولہویں اوور میں شعیب احمد تین گیندیں کھیل سکا جس میں اس نے ایک چوکے کی مدد سے چھ رنز بنائے تھے۔ سترہویں اوور کی دوسری گیند پر اس نے چھکا لگایا۔ تیسری گیند پہ چار رنز بنائے۔ اگلی گیند ایسی گیند تھی، جس کا جنید رضا شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ یہ گیند لیگ سٹمپ پہ پڑ کے مزید باہر کی جانب گھومی تھی۔ شعیب احمد نے اسے سکوئر لیگ کی طرف پُل کرنے کی کوشش کی مگر بال بیٹ پہ نہ آئی۔ جا کے اس کے پیڈز سے ٹکرائی۔

وہ مطمئن تھا گیند لیگ سٹمپ کے باہر جا رہی تھی لیکن اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب باؤلر اور وکٹ کیپر کی کمزور سی اپیل کے جواب میں امپائر محسن بلال نے اپنی انگلی فضا میں بلند کر دی۔

وہ ذرا سی دیر کے لیے سکتے کی حالت میں کھڑا رہا۔ یہ ایسا غلط فیصلہ تھا جسے ہر کوئی سمجھ سکتا تھا، مگر امپائر اپنا فیصلہ دے چکا تھا۔ اب بین الاقوامی سطح کے میچز کی طرح وہاں کوئی کیمرے تو تھے نہیں۔ نہ کوئی ڈی آر ایس سسٹم تھا کہ وہ امپائر کے فیصلے کو چیلنج کرتا۔

وہ بیٹ اپنے پیڈ پہ مارتا، افسوس اور غصے سے سر جھٹکتا، مضمحل قدموں سے چلتا گراؤنڈ سے باہر آنے لگا۔ وہاں موجود اکثر تماشائی بھی اس فیصلے کے خلاف آوازیں بلند کر رہے تھے۔ ایک جنید رضا تھا جو دل ہی دل میں خوشی سے جھوم رہا تھا۔ شعیب احمد نے ایک بار پھر اس کے لیے خفت اور ناکامی کی سرخ جھنڈی لہرائی تھی لیکن امپائر کی ملی بھگت سے اس کی پیش قدمی روک دی تھی۔

اس کے غلط آؤٹ پر افسوس اور احتجاج کرنے والوں میں عالیہ بھی تھی۔ وہ شدید برہمی سے امپائر کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ سٹوڈنٹس کا غم وغصہ اور ان کا احتجاج امپائر کے فیصلے کو تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ سو شعیب احمد آؤٹ ہو کر واپس آ گیا۔ اس سازش کا شکار ہونے سے قبل اس نے 35 رنز بنائے تھے۔ اس کے بعد تین ہی اوورز رہ گئے تھے۔ باقی کھلاڑیوں نے کوشش کی مگر اکنامکس ڈپارٹمنٹ کا سکور 149 تک بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

پولیٹیکل سائنس کی ٹیم نے 150 رنز کے تعاقب میں اپنی اننگ شروع کی۔ ان کی ابتدائی وکٹیں جلد گر گئیں۔ جس سے مطلوبہ رن ریٹ بڑھ گیا۔ یوں آئندہ آنے والے کھلاڑی آخر تک دباؤ سے نہ نکل سکے۔ مقررہ 20 اوورز میں 132 رنز ہی بنا سکے۔ ان کے 8 کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔

کپتان جنید رضا نے اپنے اختیار کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے شعیب احمد کو صرف ایک اوور باؤلنگ کرنے کا موقع دیا تھا۔ جس میں اس نے آٹھ رنز دیے تھے۔ اس کی باؤلنگ سے کوئی کھلاڑی آؤٹ نہیں ہوا مگر اس کے اوور میں رن آؤٹ ہو گیا تھا۔ اس طرح اکنامکس ڈپارٹمنٹ کی ٹیم کرکٹ کے فائنل میں پہنچ گئی۔ جہاں اس کا مقابلہ شعبۂ اردو کی ٹیم سے ہونے والا تھا۔

☆......☆......☆

عالیہ کا سکون برباد ہو گیا تھا۔ جنید رضا نے اپنا رشتہ بھیج کر اسے گویا دلدل میں دھکیل دیا تھا۔ جس سے نکلنے کی کوئی تدبیر اسے سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے اپنی تعلیم کا عذر بھی ماں کے سامنے پیش کیا تھا، مگر اس نے صاف صاف بتا دیا کہ جنید رضا کی ماں کی حالت ایسی نہیں کہ پڑھائی سے فارغ ہونے کا انتظار کیا جائے۔ ان کا اصرار ہے کہ چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو۔

انکار کی بات بھی یکسر مسترد ہو چکی تھی۔ کیوں کہ اس کے ابو وقار علی خان کو یہ منظور نہیں تھا۔ وہ رئیل اسٹیٹ کا کاروبار کرتا تھا۔ یہ ایسا کاروباری شعبہ ہے کہ صرف پیسہ زیادہ ہونا کافی نہیں ہوتا۔ مشکوک انتقال اور بے نامی زمینوں پر قبضہ جمانے یا اونے پونے ہتھیانے کے لیے قانونی اور سرکاری تعاون بھی ضروری ہوتا ہے۔

صفدر رضا ایک بڑا سیاست دان تھا۔ اس کے بیٹے سے عالیہ کی شادی ہو جاتی تو وقار علی خان کو ایک قابل بھروسہ طاقت مل جاتی۔ وہ اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اُس نے بیگم کے ذریعے عالیہ کو بتلا دیا تھا کہ انکار نہیں سنوں گا۔

عالیہ نے فریادوں کے بعد سوچنے کے لیے تین دن مزید مانگ لیے تھے۔ ایسے پریشان کن حالات میں، ڈپارٹمنٹ کی ٹیم فائنل میں پہنچ گئی تو بہ ظاہر سب کے ساتھ اس نے بھی جشن منایا تھا لیکن اس کا دل بجھا بجھا تھا۔ اس نے ایک روکھے پھیکے انداز میں ٹیم کی جیت پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔

جنید رضا نے اس سے براہِ راست رشتے کے حوالے سے بات نہیں کی تھی۔ وہ زیادہ تر کھیلوں کی سرگرمیوں میں مصروف رہتا تھا۔ اس لیے ملنا ملانا بھی کم ہوا تھا۔ عالیہ کے گھر رشتے کا پیغام بھیجنے کے بعد ایک آدھ بار ہی جنید رضا سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی بھی نظر آئی تھی، دل میں مچلتے ارمانوں کی غمازی بھی۔ اس نے زبان سے کچھ بھی نہ کہتے ہوئے آنکھوں سے سب کچھ جتلا دیا تھا کہ ابھی دور دور رہو۔ بہت جلد تمہارے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کرلوں گا۔

شعیب احمد سے بھی ایک ذرا دیر کی ملاقات ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر عالیہ کے نہاں خانۂ دل میں ٹیسیں اٹھی تھیں۔ اس لڑکے نے بہت کم مدت میں اسے متاثر کیا تھا۔ دو سال کے عرصے

میں اس سے قریب ہونے کے خوش گوار احساس سے دل ابھی پہلی پہلی بار آشنا ہوا تھا کہ ایک نہ ختم ہونے والی مسافت بیچ میں آ گئی تھی۔

اس نے اپنے دل کو کئی بار ٹٹولا تھا۔ اندر سے اٹھتی شبنمی سرگوشیوں کو سمجھنے کی کوشش کی تھی کہ کیا اُس سے محبت ہو گئی ہے؟ کیا یہ شریف سا، شرمیلا سا لڑکا اس کے دل میں گھر کر گیا ہے؟

جواب آتے آتے وہ خود سراب میں بھٹک گئی تھی۔ اب یہ دل جواب اس کے حق میں دے بھی جاتا تو کیا فائدہ ہوتا؟ بس درد کچھ زیادہ ملتا۔ احساس محرومی کا کرب کچھ سوا ہوتا۔ خوابوں کی ٹوٹی کرچیوں کی ٹیسیں کچھ زیادہ محسوس ہوتیں۔

☆......☆......☆

فائنل میچ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس سے پہلے ایک خبر یونی ورسٹی میں یہاں سے وہاں تک گردش کرنے لگی۔ جس نے کرکٹ کھیلنے والے سبھی سٹوڈنٹس میں سنسنی دوڑا دی تھی۔

خبر یہ تھی کہ پاکستان سوپر لیگ کی ایک مقبول ٹیم لاہور قلندرز کی ایک سلیکشن کمیٹی ان دنوں صوبائی دارالحکومت کے دورے پہ تھی۔ قلندرز کے سکندر پروگرام کے تحت وہ پاکستان بھر سے باصلاحیت نوجوانوں کو تلاش کرتے تھے۔ یہ پروگرام ایسے نوجوانوں کے لیے ترتیب دیا گیا تھا جو ملک میں گلی محلوں میں کھیلتے ہیں۔ ان کے اندر بھی غیر معمولی صلاحیتیں ہوتی ہیں مگر قومی دھارے تک رسائی سے محروم ہوتے ہیں۔ قلندرز کے سکندر پروگرام ایسے ہی ینگ ٹیلنٹ کو ہنٹ کرنے کے لیے لانچ کیا گیا تھا۔

صوبائی دارالحکومت میں بھی اسی پروگرام کے سلسلے میں سلیکشن کمیٹی نے دورہ کیا تھا۔ انہیں جب یونی ورسٹی سپورٹس گالا کا علم ہوا تو فائنل میچ دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ یونی ورسٹی سپورٹس کمیٹی نے ان کی خواہش شکریے کے ساتھ مان لی تھی۔ فائنل میں ان کی آمد کو بھرپور طریقے

سے ایک ایونٹ کی شکل دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

شعیب احمد کی طرح متعدد کرکٹ کھیلنے والے لڑکوں کے لیے اس خبر میں زبردست کشش تھی۔ یہ ایک شاندار موقع تھا۔ یونی ورسٹی سطح پر کرکٹ کی سمجھ بوجھ رکھنے والے، دو لڑکوں کو لے کر بڑے پُر امید تھے۔

ان میں ایک لڑکا فائنل کی دوسری ٹیم اردو ڈپارٹمنٹ کا فاسٹ باؤلر تھا۔ یہ ایک خطرناک گیند باز تھا۔ بہت تیز گیند پھینکتا تھا۔ پورے ٹورنامنٹ میں بیٹسمینوں کے لیے ایک ڈراؤنا خواب بنا رہا تھا۔ اس کا نام عمار حسن تھا۔

دوسرا کھلاڑی شعیب احمد تھا۔ اس کی بیٹنگ میں جو مہارت اور نفاست تھی، اس نے دیکھنے والوں کو حیران کر دیا تھا۔ خاص کر کوارٹر فائنل کے میچ نے اس کی مقبولیت میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔

یہ بات ہر ایک کی زبان پہ تھی کہ اگر یونی ورسٹی سے کوئی کھلاڑی قلندرز کا سکندر بن گیا تو ان دونوں میں سے کوئی ہوگا۔ جہاں بہت سے طلبا و طالبات شعیب احمد کا ذکر اچھے انداز میں کر رہے تھے وہاں جنید رضا اور اس کے ساتھی حسد اور کینہ توزی سے اس کا نام لے رہے تھے۔ جنید رضا کا بس نہیں چل رہا تھا وہ پوری یونی ورسٹی میں شعیب احمد کا نام لینے پر پابندی لگا دے۔ وہ اندر ہی اندر جل بھن رہا تھا۔ اپنے گروپ کے لڑکوں کے سامنے زہر اگل رہا تھا۔

''اس کم بخت شعیب احمد نے جیسے ساری یونی ورسٹی پر جادو کر دیا ہے۔ ہر ایک کی زبان پر اس کا نام گردش کر رہا ہے۔ اگر فائنل میں بھی بھرپور فارم کا مظاہرہ کیا تو لاہور قلندرز کی سلیکشن کمیٹی کی نظروں میں آسکتا ہے۔''

منصور نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''ہم ہاتھ ملتے ہی رہ جائیں گے۔ وہ سالا ایک ہائی پروفائل کھلاڑی بن جائے گا۔''

جعفر بولا۔ ''ویسے تو یہ صرف اندازے ہیں۔ اصل میں ہمارے اندر کا خوف اور حسد ہم سے یہ باتیں اگلوا رہا ہے۔ کیا پتا شعیب احمد فائنل میں بری طرح ناکام ہو جائے۔''

جنید رضا سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولا۔ ''اچھی بات یہ ہے کہ سلیکشن کمیٹی فائنل میچ کی بنیاد پر کھلاڑیوں کا انتخاب کرنے والی ہے۔ بس دعا یہ کرنی ہے وہ بدبخت خراب کارکردگی دکھائے۔''

منصور نے کہا۔ ''تم بااثر کپتان ہو۔ ہمت کرو۔ اسے ٹیم سے ڈراپ کر دو۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔''

جنید ناگواری سے بولا۔ ''بس کرو۔ یہ محاوروں والی تجویز اپنے پاس رکھو۔ اُس کم بخت نے ایسی مقبولیت حاصل کی ہے اب اسے ڈراپ کرنا، بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا ہے۔''

جعفر نے کہا۔ ''دیکھو کپتان! دعا سے بھی مسئلہ حل نہیں ہونے والا ہے۔ ہر بار امپائر کو بھی خرید نہیں سکتے۔ تم کپتانی کے بل بوتے پہ اسے ڈراپ بھی نہیں کر سکتے۔ اب ایک آخری آپشن ہے۔ بس یہ ذرا دل گردے کی بات ہے۔''

''ہاں ہاں۔ کھل کر بولو۔ تم کس آپشن کی بات کر رہے ہو؟''

''شعیب احمد کو کھیلنے سے روکنے کے لیے طاقت کا حربہ استعمال کرنا ہوگا۔ وہ بے چارہ تنہا یونی ورسٹی آتا جاتا ہے۔ اپنے محلے میں بھی وہ کسی بڑی حیثیت کا مالک نہیں۔ تمہارے ڈیڈی کے پالتو غنڈے موجود ہوں گے۔ دو دن بعد فائنل ٹاکرا ہے۔ اس سے ایک دن پہلے ان بدمعاشوں کے ذریعے اسے اغوا کرا کے ہاتھ پاؤں تڑوا دیتے ہیں۔ وہ کھیل کے لیے میدان

میں ہی نہ آ سکے گا تو قلندرز کے سکندر میں سلیکٹ ہونے کا اندیشہ بھی نہیں رہے گا۔"

جنید رضا سگریٹ کے دھویں پر نظریں جما کر بڑی دیر بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھیں سوچنے کے انداز میں ایک طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس کا دماغ تیزی سے جعفر کی بتائی ہوئی رائے کے سود و زیاں پہ غور کر رہا تھا۔

بڑی دیر بعد اس کے ہونٹوں پہ ایک شیطانی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے جعفر کی طرف دیکھ کر اپنا سر ہلایا۔ وہ سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اپنے شیطانی ارادوں سے شعیب احمد کی منزل کے راستے پہ کانٹے بچھانے کی حکمت عملی پہ غور کرنے لگے۔

☆......☆......☆

عالیہ ان دنوں بہت الجھی الجھی رہنے لگی تھی۔ کسی بھی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ سیمی فائنل کے بعد دو دنوں سے یونی ورسٹی بھی نہیں جا رہی تھی۔ یونی ورسٹی نہ جانے کے پیچھے دل کی بے کلی بھی تھی۔ جنید رضا سے آمنا سامنا ہونے کا خوف بھی تھا۔ وہ فی الحال اس کے سامنے جانا نہیں چاہتی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ ملاقات ہونے پر جنید رضا رشتے کی بات چھیڑ سکتا تھا۔ اسے راضی کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ ایسے میں اگر اس نے کچھ تلخ بات کہہ دی تو اپنی تُند مزاجی کے باعث وہ بھڑک اٹھے گا۔ بات پھیل گئی تو وہ یونی ورسٹی میں تماشا بن جائے گی۔ اِس سے بھی بڑھ کر اگر اُس کے ابو وقار علی خان تک یہ بات پہنچ گئی تو اس کی ناراضی الگ سے مول لینی پڑتی۔

وہ بے شک امیر کبیر باپ کی بیٹی تھی، مگر اس کی سرشت میں شرافت اور حیا بھری ہوئی تھی۔ بڑے گھروں کی ماڈرن لڑکیوں کی طرح اس میں خودسری اور نافرمانی نہیں تھی۔ وہ حکمت اور سنجیدگی سے اس دلدل سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈنا چاہتی تھی۔

ان الجھی الجھی سوچوں اور بے کل ساعتوں میں ایک بات ایسی بھی تھی جو اس کے لیے ایک خوش گوار تاثر کا سبب تھی۔

یہ شعیب احمد اور لاہور قلندرز کی سلیکشن ٹیم کی فائنل میچ میں آمد سے متعلق تھی۔ اسے یقین سا ہو رہا تھا شعیب احمد اپنے کھیل سے سلیکشن کمیٹی کو متاثر کرے گا۔ وہ اپنے ٹوٹے پھوٹے دل سے اس کی کامیابی کے لیے دعا کر رہی تھی۔ محبت کی ایسی بازی، جو شروع ہونے سے قبل ہی وہ ہار گئی تھی۔ اب وہ چاہتی تھی شعیب احمد ٹیلنٹ ہنٹ پروگرام کی یہ بازی جیت کر قلندرز کا سکندر بن جائے۔

اس خوشی کے ساتھ ہی ایک خدشہ بھی کسی میخ کی طرح اس کے دل و دماغ کو چھید کرتا تھا۔ یہ جنید کے حسد اور کینہ پروری سے متعلق تھا۔ وہ جانتی تھی اس موقع پر جنید رضا پیچ و تاب کھا رہا ہوگا۔ شعیب احمد کی مقبولیت نے اسے زہر آلود بنا دیا ہوگا۔ وہ ضرور اس زہر سے شعیب احمد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوگا۔

یہ باتیں سوچ کے اس نے یونی ورسٹی سے غیر حاضر نہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ دل پہ جبر کر کے جنید رضا کے قریب جائے گی۔ اس کی باتوں اور ارادوں سے کسی سازش کا پتا چلائے گی۔

اچانک ہی دماغ میں ایک نیا خیال پیدا ہوا۔ بہت ممکن تھا جنید رضا اس کے سامنے کھل نہ جائے۔ شعیب احمد کا راستہ روکنے کے لیے اگر کوئی سازش کر رہے ہیں تو براہ راست اس سے پتا نہ چلے۔ ایسی صورت میں کوئی ایسا ذریعہ بھی ڈھونڈنا ہوگا جو ان کی سازشوں سے واقف ہو۔ ایک دم اسے ایک تدبیر سجھائی دی۔ ایک طرح سے اسے ایک ذریعہ مل گیا تھا۔ یہ منصور نامی کھلاڑی تھا۔ جو جنید رضا کے پلیئر پاور گروپ کا حصہ تھا۔ اس کا دوست بھی تھا۔ عالیہ جانتی

تھی منصور نامی یہ لڑکا اسے دل ہی دل میں چاہتا تھا۔ اس نے کئی بار محسوس کیا تھا وہ جب بھی عالیہ کے سامنے آتا تھا اس کی آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہوتی تھی جو دل کے جذبوں کی چغلی کھاتی تھی۔

وہ ایک کم رُو لڑکا تھا۔ سماجی لحاظ سے بھی ایک کم تر گھرانے کا لڑکا تھا۔ اس وجہ سے اظہارِ محبت کی کبھی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جنید رضا کا طفیلی تھی۔ اس کا راتب کھا کے دُم ہلاتا ہوا، دوستی کا دم بھرتا تھا۔ اسے معلوم تھا جنید رضا، عالیہ سے محبت کرتا تھا۔ اس لیے اپنے مالک کی منظورِ نظر پہ ڈورے ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

عالیہ اس وقت اُسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ منصور کو نظریۂ ضرورت کے تحت محبت کے جال میں پھنسا سکتی تھی۔ وہ جنید رضا کا قریبی ساتھی ہے۔ جنید رضا کی سازشوں میں یقیناً شریک ہوسکتا ہے۔ اگر وہ شعیب احمد کے بارے میں کوئی خطرناک سازش کر رہے ہیں تو وہ ضرور جانتا ہوگا۔

اس نے کچھ مزید ان باتوں پہ غور کیا۔ کئی مزید گرہیں کھل گئیں۔ کئی مزید چالیں سجھائی دیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگلے دن وہ یونی ورسٹی جائے گی۔ منصور نامی مرغے کو محبت کے دڑبے میں قید کرنے کے لیے اپنی حکمت عملی کا آغاز کرے گی۔

☆......☆......☆

اگلے روز وہ یونی ورسٹی گئی تو اس کی نظریں دو لڑکوں کو تلاش کر رہی تھیں۔ شعیب احمد اور منصور۔ سپورٹس گالا ابھی ختم نہیں ہوا تھا اس لیے کھیلوں سے شغف نہ رکھنے والے بہت سے طلبا و طالبات یونی ورسٹی ہی نہیں آتے تھے۔ اس لیے ڈپارٹمنٹس کی راہداریاں اور سبزہ زار اکثر خالی خالی دکھائی دیتے تھے۔ زیادہ تر رش گراؤنڈز کی طرف ہوتا تھا۔

یونی ورسٹی کے دو گراؤنڈز تھے۔ایک مین گراؤنڈ تھا۔دوسرا اس سے کچھ فاصلے پر تھا جس میں پریکٹس میچز کھیلے جاتے تھے۔وہ مین گراؤنڈ کی طرف آئی۔وہاں اسے جنید رضا، منصور اور گروپ کے دوسرے لڑکے دکھائی دیے۔عالیہ قریب نہیں گئی۔ذرا فاصلے سے دور دور تک دیکھا۔اسے کہیں بھی شعیب احمد نظر نہیں آیا۔وہ کچھ سوچتی ہوئی دوسرے گراؤنڈ کی طرف چلی گئی۔وہاں بھی متعدد لڑکے موجود تھے۔ذرا سی تلاش کے بعد اسے شعیب احمد دکھائی دیا۔وہ گراؤنڈ کے دوسرے کنارے پہ چند لڑکوں کے ساتھ گھاس پہ بیٹھا ہوا تھا۔اس نے دور سے ہی عالیہ کو دیکھا۔پھر اٹھ کر اس کی طرف آیا۔

''ہیلو عالیہ! کیسی ہو تم؟ بہت دنوں سے دکھائی نہیں دے رہی تھیں؟''

وہ مسکرا کر بولی۔''یہ بہت دنوں کے بجائے دو دن کہتے تو مان جاتی۔ابھی دو دن قبل سیمی فائنل کے بعد تم سے ملاقات ہوئی تھی۔شاید بہت زیادہ خوشی کی وجہ سے تمہیں یاد بھی نہیں رہی میں۔''

''ایسی بات نہ کہو عالیہ! کچھ لوگ کسی بھی حال میں نہیں بھولتے۔تم بھی ایسی ہو۔'' یہ بات کہتے ہوئے اس کی آواز ایک ذرا کپکپائی تھی۔

عالیہ کے دل میں دھواں سا بھر گیا۔اس نے جلدی سے بات بدلتے ہوئے کہا۔''میں مین گراؤنڈ کی طرف سے آ رہی ہوں۔کپتان کے ساتھ اکثر لڑکے وہاں پریکٹس کر رہے تھے۔تم الگ سے یہاں موجود ہو؟''

اس نے تلخی سے کہا۔''کپتان کا بس چلے تو مجھے ٹیم سے ہی نکال دے۔میں اس کی تنگ دلی پہ حیران ہوں۔پچھلے دو اہم میچوں میں ٹیم کو کامیاب کرانے میں میرا اہم کردار رہا ہے۔اس کے باوجود جنید رضا سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔''

وہ دکھ سے بولی۔ ''اس کے حسد اور کم ظرفی سے کون واقف نہیں۔ تم اچھا کرتے ہو۔ اس سے دور دور رہتے ہو۔ اکٹھے پریکٹس کرتے ہوئے کسی بھی بہانے تمہیں چوٹ پہنچانے کی کوشش کرسکتا ہے۔''

''یہ اندیشہ تو مجھے ہر وقت رہتا ہے۔ خاص کر قلندرز کے سکندر کے لیے جب سے میرا نام زبان زد عام ہوا ہے۔ اس کی طرف سے کسی پاگل پن کا خطرہ مزید بڑھ گیا ہے۔''

عالیہ فکرمندی سے بولی۔ ''میں بھی اسی بات سے پریشان ہوں۔ میں ان دنوں گھر کے کسی معاملے میں پھنسی ہوئی تھی۔ یونی ورسٹی صرف اسی وجہ سے آئی ہوں کہ جنید رضا کے کسی غلط اقدام سے تمہیں باخبر کردوں۔''

وہ تشکر آمیز لہجے میں بولا۔ ''شکریہ عالیہ! میں خوش قسمت ہوں تم جیسی ہمدرد لڑکی میری دوست ہے۔ ایک جنید رضا کیا، ساری دنیا بھی خلاف ہوجائے تو سینہ تان کر مقابلہ کروں گا۔''

عالیہ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''بس بس ایسے فلمی ڈائیلاگ مت بولو۔ سنجیدگی سے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ سب کی طرح میں بھی سمجھتی ہوں قلندرز کے سکندر کے لیے تم ایک مضبوط امیدوار ہو۔ یہی بات جنید رضا کے لیے ناقابل برداشت ہوگی۔ اس لیے تم اپنی آنکھیں کھلی رکھ کے اپنی پریکٹس پہ توجہ دو۔ میں جنید رضا کے قریب ہو کے اس کی کسی سازش کا پتا چلالیتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ پلٹ کر مین گراؤنڈ کی طرف جانے لگی۔ دو تین قدم اٹھائے تھے پیچھے سے شعیب احمد کی جذبات میں ڈوبی آواز ابھری۔

''عالیہ! تم میرا اتنا خیال رکھتی ہو۔ میں اس کا صلہ نہیں دے سکتا۔ بس میرے دو ارمان

ہیں۔قلندرز کا سکندر بن جاؤں اور سب سے بڑھ کر تم سے یہ تعلق کبھی نہ چھوٹے۔''

عالیہ کے دل کو جھٹکا سا لگا۔ بڑھتے قدم لڑکھڑا سے گئے۔دل کے چور جذبے جیسے کراہ اٹھے۔اس نے ایک دم خود کو سنبھالا۔دل کو حوصلہ دیا۔پلٹ کر متانت سے بولی۔''تمہارا کرکٹ کیریئر سب سے اہم ہے۔قلندرز کے سکندر بننے کا زبردست موقع ہے۔اسے ضائع ہونے مت دو۔اپنی ساری توجہ فائنل میچ پہ دو۔''

یہ کہہ کر وہ مڑی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی مین گراؤنڈ کی طرف جانے لگی۔اب اگلا مرحلہ مرغا پھانسنا تھا۔مین گراؤنڈ کے تین طرف چنار، کیکر اور بیری کے درخت تھے۔ایک طرف سٹینڈز بنے ہوئے تھے۔وہ چنار کے ایک پیڑ کے پاس کھڑی ہوگئی۔گراؤنڈ میں متعدد لڑکے موجود تھے۔کچھ ایکسر سائز کر رہے تھے، کچھ کرکٹ کی پریکٹس کر رہے تھے۔اس نے چاروں طرف غور سے دیکھا۔اسے کہیں بھی جنید رضا دکھائی نہیں دیا۔اچانک اس کی نظر منصور پر پڑی۔وہ گراؤنڈ کے باہر چند دوسرے لڑکوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

عالیہ یہاں وہاں دیکھتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔اس کے قریب جا کے اس طرح کھڑی ہوگئی کہ وہ آسانی سے اسے دیکھ سکتا تھا۔جلد ہی وہ منصور کی نظروں میں آگئی۔عالیہ نے کن انکھیوں سے دیکھا وہ بار بار سر گھما کے اسے دیکھ رہا تھا۔

اس کے گرد جال مزید تنگ کرنے کے لیے وہ بھی پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔نظریں ملیں تو وہ ایک ذرا مسکرائی۔اتنا چارہ کافی تھا اس گھگو کے لیے۔

عالیہ نے دیکھا وہ اٹھ کے اس کی طرف آرہا تھا۔وہ زیر لب مسکرائی۔مرغا خود ہی پھنسنے کو ڈربے کی طرف بڑھ رہا تھا۔وہ بہ ظاہر گراؤنڈ کی طرف دیکھنے لگی مگر اس کی توجہ منصور پہ مرکوز تھی۔وہ جھجکتا ہوا سا قریب آیا۔عالیہ نے پیش قدمی کی۔

بے تکلفی سے بولی۔ ''ہیلو منصور! فائنل کی تیاری کیسی ہو رہی ہے؟ اس دفعہ ٹرافی ہمارے ڈپارٹمنٹ کی ہونی چاہیے۔''

اس کے چہرے پہ چمک سی آ گئی۔ ''ہم اپنی جان لڑا رہے ہیں مس عالیہ! اب دیکھتے ہیں فائنل میں کیا ہوتا ہے۔''

اس نے چارہ آگے بڑھایا۔ ''مجھے خوشی ہے تمہارے جیسے بہترین کھلاڑی ہماری ٹیم میں موجود ہیں۔ مخالف ٹیم تو پریشر میں ہی اپنا کھیل بھول جائے گی۔''

اپنی تعریف سن کے وہ منہ پھاڑ کے ہنستے ہوئے بولا۔ ''اس طرح حوصلہ افزائی ہوتی رہی تو اردو ڈپارٹمنٹ والوں کو دھول چٹا دیں گے۔''

وہ دور دور تک دیکھتی ہوئی بولی۔ ''تمہارا کپتان دکھائی نہیں دے رہا۔ ابھی کچھ دیر پہلے بھی یہاں موجود تھا۔ اب کدھر چلا گیا؟''

اس نے کہا۔ ''فائنل میچ کے سلسلے میں ہی ایک ضروری کام سے باہر گیا ہے۔ جعفر بھی اس کے ساتھ ہے۔''

''میچ جیتنے کے لیے حکمت عملی گراؤنڈ میں تیار کی جاتی ہے۔ ایسا کون سا اہم کام ہے جس کے لیے وہ یونی ورسٹی سے باہر چلا گیا ہے؟''

وہ زیر لب مسکرا کے مکاری سے بولا۔ ''بڑی بڑی بازیاں جیتنے کے لیے گراؤنڈ کے باہر بھی مہرے چلانے پڑتے ہیں۔ تبھی جا کر حریف کو شہ مات دی جا سکتی ہے۔''

عالیہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی ملائمت سے بولی۔ ''منصور! تم فارغ ہو تو کیفے ٹیریا کی طرف چلے چلتے ہیں۔ سخت پریکٹس کے بعد انرجی بھی ضائع ہوئی ہو گی۔ کچھ کھاؤ پیو گے تو توانائی بھی ملے گی۔ ڈپارٹمنٹ کے ایک بہترین کھلاڑی کے ساتھ کچھ دیر بیٹھنے کا مجھے اعزاز

بھی ملے گا۔"

منصور بے چارہ تو پہلے ہی اس کا دیوانہ تھا۔ عالیہ نے کیفے ٹیریا کی بات کچھ اس ادا سے کہی تھی کہ رہی سہی کسر بھی دور ہوئی۔ وہ چاروں شانے چت ہو گیا۔ عالیہ جیسی حسین اور خاص لڑکی اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ ایسے میں پریکٹس میچ تو کیا، فائنل بھی قربان کر سکتا تھا۔

وہ حیرت اور مسرت سے عالیہ کے ساتھ ساتھ چلتا کیفے ٹیریا کی طرف جانے لگا۔ عالیہ نے جان بوجھ کے ایسا راستہ اختیار کیا کہ فاصلہ طویل بھی تھا، رش بھی نہیں تھا۔ منصور کے قدم کچی زمین پر تھے مگر وہ خود کو جیسے ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

چلتے چلتے عالیہ نے غیر محسوس طریقے سے اپنے موبائل کا وائس ریکارڈر آن کیا۔ پھر کہا۔ "تمہارے جیسے باصلاحیت لڑکے کے لیے صرف فائنل ہی ٹارگٹ نہیں ہونا چاہیے۔ قلندرز کے سکندر بننے کا جو سنہرا موقع ہے اس سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

وہ دبے دبے جوش کے ساتھ بولا۔ "جی ہاں! یہ واقعی ایک شاندار موقع ہے۔ تم کہتی ہو تو میں اپنی ساری کوشش کروں گا۔"

اس نے کہا۔ "یونی ورسٹی میں شعیب احمد کا نام ہر ایک کی زبان پر ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں تکنیک اور سٹائل میں تم اس سے بہتر ہو۔"

جوش مسرت سے جیسے اس کے قدم ڈگمگانے لگے۔ وہ کپکپاتی آواز میں بولا۔ "یہ بات تو ہے۔ پتا نہیں اس کم بخت میں ایسا کیا خاص ہے سب اسی کا نام لے رہے ہیں۔"

"زبانِ خلق کو نقارۂ خدا بھی کہا جاتا ہے۔ کیا پتا تم سب کو پیچھے چھوڑ کے وہ قلندرز کے سکندر کے لیے منتخب ہو جائے۔"

''اس کا تو باپ بھی سلیکٹ نہیں ہو سکے گا مس عالیہ!'' اس نادان کی زبان پھسل گئی۔

''کیا مطلب! اسے کون روک سکے گا؟''

کچھ تو عالیہ کی صحبت، کچھ اس کی تعریف سے منصور جیسا چغد لڑکا، ناسمجھی میں وہ کہہ گیا جس کا عالیہ کو انتظار تھا۔ اس کی زبان پھسل گئی تو بس پھسلتی ہی چلی گئی۔ ''سالے نے ایک اچھی اننگ اتفاق سے کیا کھیلی ہے کہ ہیرو بن گیا تھا۔ اب زیرو بنا کر چھوڑ دیں گے۔''

''اُس الو کو ہیرو کون مانتا ہے؟'' عالیہ نے مرغے پر جال مزید پھیلا دیا۔ ''میرا بس چلے تو اسے کھیلنے کا موقع بھی نہ دوں۔ ویسے اسے زیرو بنانے کے لیے جنید رضا نے کچھ پلان کیا ہوگا؟''

''خیر، رہنے دو اس بات کو۔ فائنل میں تمہیں پتا چل جائے گا۔'' اس نے پر پھڑ پھڑا کے جال سے نکلنے کی کوشش کی۔

عالیہ نے اگلی چال چلی۔ بے تکلفی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ پھر اک ذرا شوخی سے ہنستے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے کیا چھپا رہے ہو یار! میں نے تو کبھی خود کو اس گروپ سے الگ نہیں سمجھا ہے۔ کیا مجھ پہ شک کرتے ہو؟''

عالیہ کی اس ادا اور شوخی بھری ہنسی نے اس کے پھڑ پھڑ کرتے پروں کو یک دم ساکت کر دیا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''بات شک کی نہیں یار! اصل میں کچھ باتیں بڑی نازک اور حساس ہوتی ہیں۔ ان کے اثرات بڑے بھیانک ہوتے ہیں۔ اس لیے راز میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔''

''تمہاری بات درست ہے۔ راز کی حفاظت کرنی چاہیے مگر مجھ سے کیا پردہ ہے؟ کیا میں تم جیسے دوستوں کو دھوکا دوں گی؟ ویسے سیمی فائنل کی طرح امپائر کی خدمات حاصل کرنے کا

منصوبہ ہے کیا؟''

وہ چونکتے ہوئے بولا۔''اس کا تمہیں کیسے پتا چلا؟ یہ بات تو ہم چار لڑکوں کو معلوم تھی۔ کیا جنید رضا نے بتایا تھا؟''

عالیہ کے دل کو جھٹکا لگا۔ اس نے اندازے سے امپائر والی بات کی تھی۔ جس انداز سے شعیب احمد کو آوٹ قرار دیا گیا تھا اس سے شک تو تھا مگر ثبوت نہیں تھا۔ منصور نے اپنی سادگی کی وجہ سے اس جرم سے بھی پردہ ہٹا دیا تھا۔

''جی ہاں جنید رضا نے بتایا تھا۔ پلیز اسے یہ بات مت بتانا۔ اس نے کسی اور کو بتانے سے منع کیا تھا۔ وہ پھر مجھ پر اعتبار نہیں کرے گا۔ اب تم تو اعتبار کرو نا یار! اس دفعہ کیا منصوبہ بندی کی ہے شعیب احمد کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے؟''

وہ دونوں اس وقت کھلے سبزہ زار کے بیچ پکی روش پہ چلتے ہوئے کیفے ٹیریا کی طرف جا رہے تھے۔ کیفے ٹیریا اب زیادہ دور نہیں رہا تھا۔ عالیہ نے سوچا جو بات وہ منصور سے اگلوانا چاہتی ہے، کیفے ٹیریا پہنچنے سے پہلے اسے کہہ دینا چاہیے۔ ورنہ وہاں پہنچ گئے تو سٹوڈنٹس کا رش ہوگا، شور وغل ہوگا۔ بہت ممکن ہے جان پہچان والے لڑکے لڑکیاں ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ ایسے میں منصور بتانے سے انکار بھی کر سکتا تھا۔

اچانک اسے ایک تدبیر سجھائی دی۔ اس نے جھک کر اپنا ایک پاؤں تھام لیا۔ چہرے پہ درد کے تاثرات پیدا کر کے چپل اتارنے لگی۔ پھر اپنی انگلیوں سے داہنے پیر کا انگوٹھا مسلنے لگی۔

منصور پریشان سا ہو کر بولا۔''کیا بات ہے مس عالیہ! کیا پاؤں میں تکلیف ہو رہی ہے؟''

وہ تکلیف سے بولی۔''جی ہاں۔ اچانک ہی پیر کے انگوٹھے میں درد جاگ اٹھا ہے۔ پلیز،

دو چار منٹ یہاں ٹھہر جاتے ہیں۔ ایک ذرا آرام آیا تو آگے بڑھیں گے۔"

پکی روش کے ساتھ پھلواریاں تھیں۔ ان کے قریب سنگی بنچیں تھیں۔ وہ ایک پتھریلی بنچ پہ آکے بیٹھ گئے۔

عالیہ ہولے ہولے اپنے پیر کا انگوٹھا سہلاتی ہوئی بولی۔ "کرکٹ جنٹلمین گیم ہے۔ اس میں کھیلنے والے بھی باوقار اور باعزت ہونے چاہئیں۔ وہ شعیب احمد مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اب خدا ناخواستہ اس نے فائنل میں ایک بار پھر غیر معمولی کارکردگی دکھادی اور لاہور قلندرز کی سلیکشن کمیٹی کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوگیا تو میں آئندہ کرکٹ سے تعلق ہی نہیں رکھوں گی۔"

وہ تڑپ کر بولا۔ "تم فکر مت کرو مس عالیہ! وہ اس میں کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔ وہ فائنل ہی نہیں کھیل سکے گا۔"

"کیا جنید رضا پلیئر پاور استعمال کر کے اسے فائنل الیون سے ڈراپ کردے گا؟ کیا ایسا کرنا آسان ہوگا؟"

"نہیں۔ یہ بہت مشکل ہوگا۔ اس کم بخت کے لیے سٹوڈنٹس ہنگامہ کھڑا کردیں گے۔ ہمارا منصوبہ اس دفعہ کچھ اور ہے۔ جنید رضا کے ڈیڈی کے کچھ پالتو بدمعاش ہیں۔ ان میں سے ایک بدمعاش شمروز خان سے فون پر بات ہوئی ہے۔ ابھی گراؤنڈ سے اٹھ کر جنید رضا اور جعفر اسی کے پاس گئے ہیں۔ وہ بدمعاش شمروز خان اپنے ساتھیوں کے ساتھ فائنل سے ایک دن پہلے یعنی کل شام کو شعیب احمد کو اغوا کرلے گا۔ اس کی ایک ٹانگ یا بازو توڑ کے واپس گھر کے قریب چھوڑ دے گا۔ وہ اپنے ناکارہ بازو کی وجہ سے فائنل نہیں کھیل سکے گا۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ یہ کام جنید رضا نے کرایا ہے۔ کیوں کہ وہ بدمعاش اپنے چہرے چھپا کے یہ واردات

کریں گے۔اس طرح بے چارہ شعیب احمد اپنے زخم چاٹتا ہوا،اپنی حسرتوں اور محرومیوں کی قبر پہ آہ وزاریاں کرتا ہوا اپنے گھر میں پڑا رہے گا۔ہم فائنل میچ کھیلیں گے۔جیت گئے تو کیا کہنا،ہارے بھی تو بازی مات نہیں......"

عالیہ کے کان سنسنا رہے تھے۔اس کی رگوں میں خون جیسے منجمد ہو گیا تھا۔پورے بدن میں غم،غصہ اور افسوس کے لاوے پھٹ رہے تھے۔اس کے جی میں آ رہا تھا چیخ چیخ کر سب کو بتا دے کہ ایک ہونہار اور باصلاحیت نوجوان کا راستہ روکنے کے لیے جنید رضا اور اس کے بیمار ذہن والے ساتھی کیسے زہریلے حربے اختیار کر رہے تھے۔

لیکن اس نے بڑی مشکل سے خود پہ قابو پایا۔ابھی اس کا کام مکمل نہیں ہوا تھا۔وہ اس کام کو ایسے انجام دینا چاہتی تھی کہ معاملہ بگڑے بھی نہیں اور شعیب احمد فائنل میچ کھیل کے قلندرز کے سکندر کا حق دار بھی ٹھہرے۔

وہ منصور کے ساتھ کیفے ٹیریا میں آ گئی۔اب صرف رسمی کارروائی پوری کرنی تھی۔اس نے جبر کر کے اس کے ساتھ وہاں کچھ وقت گزارا۔چائے کافی جلدی سے ختم کر کے،ایک ضروری کام کا بہانا کر کے اس سے الگ ہو گئی۔تیز تیز چلتی ہوئی پارکنگ ایریا کی طرف آئی۔کبھی کبھار وہ خود اپنی کار لے کر یونی ورسٹی آتی تھی۔آج بھی وہ خود ڈرائیونگ کر کے آئی تھی۔

وہ اپنی کار میں بیٹھ گئی۔اس کے دل و دماغ میں تیز آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔اس نے تیزی سے کار آگے بڑھائی۔اس کا رخ یونی ورسٹی کے خارجی راستے کی طرف تھا۔اس کا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔منصور نے جو انکشاف کیا تھا وہ ایسا ہولناک تھا اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟

کیا شعیب احمد کو سب کچھ بتا دے؟ ان کی سازش سے پردے ہٹا دے؟ کیا جنید رضا

سے براہِ راست بات کرلے؟

شعیب احمد کو بتانے پہ دماغ راضی نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے خلاف ہونے والی سازش کے بارے میں سن کو وہ بہت پریشان ہوگا۔ بے شک وہ احتیاطی تدابیر اختیار کر کے جنید رضا اور اس کے حواریوں کی دشمنی سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ لیکن اس کے اعصاب ڈھے جاتے۔ ذہن اور دل پہ خوف سوار ہو جاتا۔ اس طرح فائنل میچ میں اس کی کارکردگی بری طرح متاثر ہو جاتی۔ اس کے سامنے صرف ڈپارٹمنٹ کا فائنل میچ نہیں تھا۔ قلندرز کے سکندر میں منتخب ہونے کا کڑا مرحلہ بھی تھا۔ جس کے لیے جسمانی ہی نہیں، ذہنی فٹنس بھی بہت ضروری تھی۔

عالیہ اس خطرناک سازش کو یونی ورسٹی انتظامیہ سے بھی چھپانا چاہتی تھی۔ ان کے علم میں لانے سے معاملہ گمبھیر ہو جاتا۔ ظاہر ہے یونی ورسٹی انتظامیہ تحقیقات شروع کرلیتی۔ اس طرح فائنل میچ کا انعقاد خطرے میں پڑ جاتا۔ لاہور قلندرز کی ٹیم بھی ایسے حالات میں یونی ورسٹی کا دورہ منسوخ کرلیتی۔ یوں شعیب احمد کے لیے مین سٹریم کرکٹ کے دروازے کھلنے کی جو امید بنی تھی، وہ معدوم ہو جاتی۔

اب عالیہ کے پاس اک آخری آپشن تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے سٹیئرنگ سنبھالا۔ دوسرے سے موبائل نکال کے جنید رضا کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ تیسری گھنٹی کے بعد اس کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

’’ہیلو عالیہ! یہ تم ہو! بائی گاڈ، میں تو ترس گیا تھا تمہاری آواز سننے کو۔‘‘

وہ خشک لہجے میں بولی۔ ’’میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ تم اس وقت کہاں ہو؟‘‘

’’زہے نصیب! میں خود تم سے ملنے والا تھا۔ بس فائنل میچ کی ٹینشن کی وجہ سے فرصت نہیں مل رہی ہے۔‘‘

اس نے سرد سے لہجے میں کہا۔ ''دیکھو جنید رضا! اس وقت تم سے ملنا بہت ضروری ہے۔ یوں سمجھو یہ فائنل میچ کی طرح اہم ہے۔''

وہ بولا۔ ''میں اس وقت ایک جگہ اہم میٹنگ میں ہوں۔ فارغ ہو کر خود ہی کال کروں گا۔''

یہ کہہ کر جنید رضا نے رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ بھی اس وقت اپنی کار چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پہ جعفر بیٹھا ہوا تھا۔

''تم کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔ عالیہ نے کچھ کہا ہے کیا؟'' جعفر نے کہا۔

''وہ ملنا چاہتی تھی۔ پتا نہیں کیا اہم بات ہے؟''

''خیریت ہوگی۔ ویسے تم اس کے بارے میں بہت سنجیدہ ہو۔ کیا پروپوز کرنا چاہتے ہو؟''

''پروپوز کو چھوڑو یار! میں نے سیدھا سیدھا اس کے لیے رشتہ بھیجا ہے۔ اس کی طرف سے رضامندی کا انتظار ہے۔ فائنل میچ کی پریشانی میں کسی کو بتایا بھی نہیں۔''

''واہ! تم نے تو بہت بڑا چھکا مارا ہے۔ یہ بتاؤ کیوں ملنا چاہتی تھی ہماری بھابی صاحبہ؟''

''اس کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔ جیسے وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہو۔ شمروز خان سے ملاقات سے فارغ ہو کر اس سے بات کرلوں گا۔''

اسی وقت اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے موبائل کی سکرین میں دیکھ کر کہا۔ ''لو، اسی شمروز خان کی کال ہے۔''

اس نے بٹن دبا کے ہیلو کیا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''چھوٹے صاحب! میں کب سے انتظار کر رہا ہوں۔ آپ کب آ رہے ہیں؟''

''بس قریب پہنچ گئے ہیں۔ دس منٹ مزید انتظار کرلو شمروز خان۔''

رابطہ منقطع کر کے اس نے اپنی کار کی رفتار مزید تیز کر لی۔ ذرا ہی دیر میں وہ شمروز خان کے ٹھکانے پہ پہنچ گئے۔ شمروز خان علاقے کا نامی گرامی بدمعاش تھا۔ ہمارے ملک کی سیاست میں دولت، حیثیت اور منافقت کے ساتھ ساتھ اپنی حاکمیت کی دھاک بٹھانے کے لیے بدمعاش کلچر بھی عام ہے۔ بڑے بڑے سیاست دان اپنے مخالفین کو دبانے کے لیے یا پھر چھوٹے بڑے سرکاری افسروں کو ڈرا دھمکا کے اپنا کام نکلوانے کے لیے بدمعاشوں کو بھی پالتے رہتے ہیں۔

شمروز خان بھی، ایم این اے صفدر رضا کا پالتو بدمعاش تھا۔ شعیب احمد کو فائنل سے باہر کرنے کے لیے اب اس کا بیٹا جنید رضا اس بدمعاش کی خدمات حاصل کرنے آیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں اس کے ٹھکانے پہ پہنچ گئے۔ شمروز خان اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ ''چھوٹے صاحب! حکم کریں۔ بندہ حاضر ہے۔ کسی کو ٹھکانے لگانا ہے؟ کسی کو غائب کرانا ہے؟''

جنید رضا نے کہا۔ ''شمروز خان! تم علاقے کے بڑے بدمعاش ہو۔ تمہارے کارنامے بھی بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ مگر میرا کام چھوٹا سا ہے۔ ایک لڑکے کو کچھ گھنٹوں کے لیے غائب کرانا ہے۔ پھر اس کا ایک بازو یا ایک ٹانگ توڑ کے واپس چھوڑ دینا ہے۔''

شمروز خان زور زور سے قہقہے لگاتے ہوئے بولا۔ ''بس اتنا سا کام ہے؟ یہ تو کسی محلے کا بدمعاش بھی آسانی سے کر سکتا تھا۔ میری کیا ضرورت تھی؟''

''شمروز خان! مجھے اس بات سے غرض نہیں کون ایسا کرتا ہے۔ بس تم اپنے ذمے یہ کام کراؤ۔ میں تمہیں اس کا پتا بتا دیتا ہوں۔ اس کی تصویر بھی تمہیں واٹس اپ کریں گے۔ بس خیال رہے اس میں کہیں بھی ہمارا نام نہیں آنا چاہیے۔ کل رات کو لازمی یہ کام

ہونا چاہیے۔ یہ بھی یاد رکھو اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچانا ہے۔ بس ایک ٹانگ یا بازو بیکار کرنا ہے۔'' جنید رضا نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کے اس کے آگے میز پہ رکھ دی۔

جعفر نے اپنے موبائل سے شعیب احمد کی تصویر اسے واٹس اپ کر دی۔ ساتھ ہی شعیب احمد کے گھر کا ایڈریس بھی سمجھا دیا۔

شمروز سے ملاقات ختم ہوئی تو جنید رضا نے فوراً عالیہ کو فون کیا۔ وہ خود بھی بڑی بے تابی سے اس کے فون کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے ملاقات کا وقت اور جگہ مقرر کر کے رابطہ ختم کر دیا۔

جنید رضا نے جعفر کو ایک دو ہدایات دیں۔ پھر اسے ایک جگہ کار سے اتار کر عالیہ سے ملاقات والے مقام کی جانب روانہ ہوا۔

عالیہ اپنی سماجی تنظیم کے دفتر کے باہر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جنید رضا نے اسے وہاں سے اپنی کار میں بٹھایا۔

''عالیہ! حکم کرو۔ کسی ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھ جائیں یا پھر کہیں لانگ ڈرائیونگ پہ چلے جائیں؟''

وہ ٹھہرے لہجے میں بولی۔ ''دریا کی طرف جو ریور ویو ریسٹورنٹ ہے۔ وہاں چلے چلتے ہیں۔ اس وقت وہاں کافی خاموشی اور سکون ہوتا ہے۔''

جنید رضا کن انکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم ٹھیک ہو نا؟ تمہارا لہجہ کچھ بدلا بدلا سا ہے۔''

''بدلا بدلا سا لہجہ، اندرونی اتھل پتھل کی کہانی سناتا ہے۔ یہ زیادہ خطرناک بات نہیں ہوتی

ہے۔ اصل خطرہ تو چہرے بدل کے انسان سے شیطان کا روپ دھارنے سے ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

اس کے دل میں چور تھا۔ چوری چوری اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایسا گاڑھا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ تم ایک ذرا آسان الفاظ میں بتاؤ۔ کس بدبخت نے تمہارے لیے شیطان بننے کی جرأت کی ہے؟ میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔''

عالیہ پھیکے سے انداز میں ہنسی۔ ''جی ہاں۔ تمہارے لیے دوسروں کے ٹکڑے کرا دینا کچھ بھی مشکل نہیں۔ تمہارے ڈیڈی کے بہت سے پالتو غنڈے ایک اشارے کے منتظر ہوں گے۔ تم جسے چاہو ان کے ذریعے اٹھوا سکتے ہو۔ ان کے ہاتھ پاؤں تڑوا سکتے ہو۔''

اس نے پریشان سا ہو کر کہا۔ ''عالیہ! تم یہ کیسی الجھی الجھی باتیں کر رہی ہو؟ میں تو سمجھا تھا تم سے کچھ اچھی باتیں سنوں گا۔ میں نے دل کے سچے جذبوں سے تمہیں اپنا بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میری ممی، میری بہنیں اور میں خود تمہارے جواب کا بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں۔ تم نے ابھی مجھ سے ملنے کی بات کی تو میں یہی سوچ رہا تھا کہ تم اسی سلسلے میں بات کرنا چاہتی ہو گی۔ مستقبل میں اپنے رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے تمہارے دل میں میرے حوالے سے کوئی شک و شبہ ہے تو اسے دور کرنے کے لیے بات کرنا چاہتی ہو گی۔ لیکن تم تو سمجھ میں نہ آنے والی باتیں کر رہی ہو۔''

عالیہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''تم نے میرے لیے رشتہ بھیج کر مجھے جس کشمکش میں مبتلا کیا ہے، اس کا بھی ذکر ہو گا۔ اس سے پہلے ایک اور اہم معاملہ ہے۔ جس کا حل تمہارے پاس ہے۔''

''تم کس معاملے کی بات کر رہی ہو؟ میں سخت بے چین ہوں۔ پلیز جلدی سے بتا دو۔''

''میرے موبائل کے وائس ریکارڈر میں دو چار منٹ کی گفتگو محفوظ ہے۔ ریسٹورنٹ پہنچ کر پہلے تم وہ گفتگو سن لو۔ اس کے بعد اگلی بات کریں گے۔''

ریور ویو (river view) ریسٹورنٹ قریب ہی تھا۔ وہ پانچ منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ اس کے کشادہ سبزہ زار میں دو چار میزوں پہ کچھ لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دونوں دریا کی سمت ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ دریا سے اٹھتی لہروں کا ہلکا ہلکا شور چاروں اور پھیلا ہوا تھا۔

جنید رضا نے بیٹھتے ہی کہا۔ ''عالیہ! تم مجھے بہت پریشان کر رہی ہو۔ تمہارے موبائل میں ایسی کون سی گفتگو ریکارڈ ہوئی ہے جس کے لیے اتنا پُراسرار ماحول پیدا کر رہی ہو؟''

عالیہ نے موبائل نکالا۔ منصور کی جو باتیں اس نے ریکارڈ کی تھیں، وہ آن کر کے موبائل سامنے میز پہ رکھ دیا۔ دریا سے ابھرتے پانی کے شور کے ساتھ ساتھ منصور کی انکشاف انگیز باتیں بھی کانوں سے ٹکراتی رہیں۔ عالیہ دیکھ رہی تھی اُس کے چہرے پہ کئی رنگ لہراتے رہے تھے۔ وہ غصے اور بے قراری سے بار بار پہلو بدلتا جا رہا تھا۔ منصور کی باتیں ختم ہونے سے قبل ہی اس نے غصے سے میز پہ ہلکا سا مکا مارا۔ پھر ہولے سے گرج کر کہا۔ ''عالیہ! یہ سب کیا بکواس ہے؟ اور اس کے پیچھے تمہارا مقصد کیا ہے؟''

وہ متانت سے بولی۔ ''جسے تم بکواس کہہ رہے ہو یہ ایک ناقابل تردید سچائی ہے۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو؟ کیا میری طرف آنے سے پہلے تم شمروز خان نامی بدمعاش سے ملنے نہیں گئے تھے؟''

وہ سرخ سرخ آنکھوں سے بولا۔ ''تم یہ سب کیوں کر رہی ہو؟ اس بدبخت شعیب احمد سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟''

اس نے لاپرواہی سے کہا۔ ''بات محض شعیب احمد سے ہمدردی کی نہیں ہے۔اس سے زیادہ کرکٹ گیم کو کرکٹ دشمن عناصر سے پاک کرنے کا میرا جذبہ ہے۔تم جانتے ہو مجھے کرکٹ کا کتنا کریز ہے۔میں کرکٹ صرف دیکھتی اور کھیلتی نہیں۔کرکٹ کو ایک جنٹلمین گیم بنانے کی کوشش بھی کرتی ہوں۔منصور کی گفتگو ریکارڈ کرنے کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما ہے۔''

وہ اپنا غصہ برداشت کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو عالیہ! تم اس پاگل پن سے باز آجاؤ۔ ایک تمہاری کوششوں سے کرکٹ، بقول تمہارے گندے عناصر سے پاک نہیں ہوسکتی۔تم ایک یونی ورسٹی کی سطح کی کرکٹ کو ٹھیک کرکے کیا حاصل کرو گی جب قومی اور بین الاقوامی سطح پر کرکٹ میں سیاست، منافقت، ناجائز دولت، اقربا پروری اور بدمعاشی کا دوردورہ ہے۔''

وہ تیز لہجے میں بولی۔ ''تم مجھے دنیا کی مثالیں مت دو۔میں اپنے دائرۂ اثر میں جو اصلاح کرسکتی ہوں، اس پر عمل کرتی رہوں گی۔تمہیں اس معاملے میں میری بات ماننی ہوگی۔''

وہ بھڑک کر بولا۔ ''مجھ پر اپنا رعب مت جماؤ عالیہ! اگر تمہاری بات ماننے سے انکار کروں گا تو کیا کرو گی؟''

وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ ''ایسی صورت میں تمہارا بھیجا ہوا رشتہ قبول کرنے سے انکار کروں گی۔''

جنید رضا نے ٹھٹک کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔حیرت اور غصے سے اس کے چہرے پہ جیسے زلزلے کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔اسی اثنا میں ریسٹورنٹ کا ویٹر ان کی طرف آیا۔جنید رضا غصے کی شدت سے ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

عالیہ نے پہل کی۔ویٹر کو کافی لانے کا آرڈر نوٹ کرایا۔اس دوران جنید رضا کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوگیا تھا۔وہ گھورتی ہوئی نظروں سے عالیہ کو دیکھے جارہا تھا۔

عالیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دیکھو جنید رضا! شادی کے لیے ذہنی ہم آہنگی بہت ضروری ہے۔ تم ایک مجرمانہ عمل کے ذریعے کسی کا کیریئر تباہ کرنا چاہتے ہو۔ اگر اپنی ہونے والی بیوی کے کہنے پر تم اس سے باز نہیں آتے ہو تو یہ ہم آہنگی نہیں ہوگی۔ سراسر مردانہ بدمعاشی ہوگی۔ کیا تم بدمعاشی کے ذریعے مجھے حاصل کر سکتے ہو؟ تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو۔ ذرا سوچو میری پسند کے برعکس ایک مجرمانہ فعل سرانجام دے کر محبت کا دعویٰ درست ہو سکتا ہے؟''

وہ لفظ چباتے ہوئے بولا۔ ''تم جانتی ہو عالیہ! میں اس کم بخت شعیب احمد سے کتنی نفرت کرتا ہوں۔ کیا میرے لیے ممکن ہوگا کہ اسے کامیاب ہوتے ہوئے دیکھ سکوں؟''

''اس سے نفرت ایک اخلاقی برائی ہے۔ یہ تمہارا ذاتی مسئلہ ہے جبکہ اسے نقصان پہنچانے کا منصوبہ ایک سماجی برائی ہے۔ یہ اجتماعی مسئلہ ہے۔ میں کبھی نہیں چاہوں گی میرا ہونے والا شوہر محض حسد اور تنگ نظری کی وجہ سے سماجی برائی میں مبتلا ہو جائے۔''

وہ جھنجھلا کر بولا۔ ''تم میری مجبوری کا غلط فائدہ اٹھا رہی ہو عالیہ! تم جانتی ہو میری ممی موت اور زندگی کی سرحد پہ ہیں۔ وہ میری شادی جلد سے جلد کرانا چاہتی ہیں۔ اس کے علاوہ میں خود بھی تمہیں اپنی شریکِ حیات بنانا چاہتا ہوں۔ اسی بات کو لے کر تم مجھ سے اپنی بات منوانا چاہتی ہو۔ ٹھیک ہے۔ بتاؤ مجھے۔ کیا چاہتی ہو آخر؟''

عالیہ متانت سے بولی۔ ''تمہاری یہ بات غلط ہے جنید رضا کہ تمہاری مجبوری کی وجہ سے دباؤ ڈال رہی ہوں۔ اس کے برعکس یوں سمجھ لو اگر تم اپنی شریکِ حیات بنانا چاہتے ہو تو میری خواہشات اور ترجیحات کا احترام کرنا ہوگا۔ میں یقین سے کہتی ہوں میری کوئی خواہش اور کوئی پسند ہرگز ایسی نہیں ہوگی کہ میرے مجازی خدا کا سر جھک جائے۔ بلکہ میں چاہوں گی وہ سماجی

اور اخلاقی قدروں کا لحاظ کرتے ہوئے سر اٹھا کے زندگی گزار لے۔"

وہ چند ثانیے گھورتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"میں نے تم سے محبت کی ہے عالیہ! اس محبت کی خاطر میں بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہوں۔ اسی محبت کے لیے میں اپنے ارادوں سے باز آتا ہوں۔ میں، صفدر رضا کا بیٹا جنید رضا تم سے وعدہ کرتا ہوں، شعیب احمد کے خلاف کوئی سازش نہیں کروں گا۔ اب تم بھی وعدہ کرو۔ آج شام سے پہلے اپنی امی کے ذریعے، میری بہنوں کو اپنی رضامندی کی خوش خبری سناؤ گی۔"

"مجھ پہ بھروسہ کرو جنید رضا! میری نیت میں کوئی فتور نہیں۔ میں اپنی رضامندی کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ لیکن آج کی پابندی نہ لگاؤ۔ تم اپنے وعدے کے مطابق شعیب احمد کو ایک فیئر پلے کا موقع دو۔ تم نے پورے ٹورنامنٹ میں اسے درست طریقے سے باؤلنگ اور بیٹنگ کا موقع نہیں دیا۔ میری خواہش ہے کل فائنل میچ میں اسے پورے چار اوورز باؤلنگ کرنے دو۔ وہ پانچویں اور چھٹی پوزیشن پہ بیٹنگ کرتا ہے۔ اسے اس کی پسندیدہ پوزیشن پہ بلے بازی کے لیے بھیج دو۔ میں زبان دیتی ہوں فائنل میچ کی شام تمہارے گھر میرا رشتہ پکا ہونے کی خوش خبری مل جائے گی۔"

اب ایک ہی صورت تھی۔ دل کے لٹے قافلوں کی دھول دھول مسافتوں پہ جس شخص نے کچھ لمحوں کے لیے اسے محبت سے آشنا کرا دیا تھا۔ اسے کھیل کے میدان میں کچھ بازیاں جیتنے کا موقع دے دے۔

دل کی عدالت میں وہ خود ہی وکیل بن گئی تھی۔ خود ہی منصف بن کر جنید رضا کو اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

☆......☆......☆

فائنل میچ کا میدان سج گیا۔ یونی ورسٹی گراؤنڈ میں طلبا و طالبات کا ہجوم تھا۔ جوش وخروش، نعرہ بازی اور لاؤڈ سپیکر سے گونجتی ہوئی کمنٹیٹر کی ہیجان انگیز آواز نے سماں باندھ دیا تھا۔

گراؤنڈ کے تین طرف پیڑوں تلے کی گھاس پہ سٹوڈنٹس کھڑے اور بیٹھے ہوئے تھے۔ چوتھی سمت جو سٹینڈز تھے وہاں کرسیاں اور صوفے لگائے گئے تھے۔ان پہ یونی ورسٹی اساتذہ اور مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔

مہمانوں میں خصوصی طور پر لاہور قلندرز کی سلیکشن کمیٹی کے ممبران نمایاں تھے۔ان میں ایک ممبر قومی ٹیم کا معروف آل راؤنڈر محمد حمید تھا۔جس نے اپنی بیٹنگ اور باؤلنگ سے بڑے بڑے میچوں میں قومی ٹیم کی جیت میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ دوسرا ممبر قومی ٹیم کا ایک سابق فاسٹ باؤلر آصف جاوید تھا۔ جو کہ اس وقت لاہور قلندرز کا باؤلنگ کوچ تھا۔

کمنٹیٹر بار باران معروف کھلاڑیوں کا ذکر کر کے ماحول کو گرما رہا تھا۔قلندرز کے سکندر میں سلیکٹ ہونے کے لیے فائنل کے کھلاڑیوں کو ان جیسی کارکردگی کی ترغیب دے رہا تھا۔

فائنل کا ٹاس اردو ڈپارٹمنٹ کی ٹیم جیت گئی تھی۔اس نے پہلے خود بیٹنگ کا فیصلہ کیا تھا۔

شعیب احمد آخری لمحوں تک پُر یقین نہیں تھا کہ کپتان جنید رضا اسے کھلائے گا۔اسے اندیشہ تھا وہ اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے اسے فائنل الیون سے ڈراپ کردے گا لیکن جب آخری گیارہ کھلاڑیوں میں اس کا نام شامل ہو گیا تبھی اس کا اضطراب دور ہوا تھا۔وہ نہیں جانتا تھا اس کے خلاف جنید رضا اور اس کے حواریوں نے کیسی کیسی سازشیں کی تھیں؟ اسے معلوم نہیں تھا اگر عالیہ اس کی پشتی بان نہ بن جاتی تو وہ نہ صرف فائنل کھیل سے باہر ہو جاتا بلکہ اپنی ٹانگ یا بازو سے بھی محروم ہو جاتا۔

شعیب احمد کو شدید تعجب اس وقت ہوا جب کپتان نے اس سے پورے چار اوور بالنگ

کرائی۔ ایک خوش گوار حیرت اور جوش کے ساتھ اس نے لگاتار چار اوور کیے۔ جن میں اس نے 25 رنز دے کر دو وکٹیں حاصل کی تھیں۔

اردو ڈپارٹمنٹ کی ٹیم نے مقررہ 20 اوورز میں سات وکٹوں کے نقصان پر 138 رنز بنائے۔ شاید یہ فائنل کا پریشر تھا یا یہ احساس کہ قومی سطح کے بڑے کھلاڑی ان کا کھیل دیکھ رہے ہیں، اردو ڈپارٹمنٹ کا کوئی بھی کھلاڑی جم کر کھیل نہ سکا تھا۔ جس کی بدولت وہ ٹورنامنٹ کا ایک چھوٹا سکور بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

سکور بڑا نہیں تھا مگر اکنامکس ڈپارٹمنٹ کی ٹیم بھی فائنل کے پریشر میں تھی۔ کیوں کہ جب ان کی بیٹنگ شروع ہوئی تو ایک ڈرامائی صورت حال کے ساتھ ان کی اننگ آگے بڑھی تھی۔

اکنامکس ٹیم کے اوپنرز نے بہت احتیاط سے کھیل کر پہلے چھ اوورز کے پاور پلے میں محض 30 رنز بنائے۔ اس کے بعد جیسے ایک قطار لگ گئی۔ اگلے چار اوورز میں ان کے 4 کھلاڑی یکے بعد دیگرے آؤٹ ہو گئے۔ اور سکور صرف 50 رنز تھا۔ یہ ایسی صورت حال تھی جس نے اچانک ہی اکنامکس ڈپارٹمنٹ کو شدید دباؤ کا شکار کر دیا۔

اردو ڈپارٹمنٹ کا خطرناک باؤلر عمار حسن جس کا نام قلندرز کے سکندر کے طور پر بھی لیا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے ابتدائی 2 اوورز میں تباہی مچائی تھی۔ اس نے دس رنز کے عوض 3 وکٹیں حاصل کی تھیں۔ کپتان جنید رضا ایک بار پھر ناکام ہوا تھا۔ اس نے محض 12 رنز بنائے تھے۔

جب 50 کے مجموعی سکور پر چار کھلاڑی آؤٹ ہو گئے تو شعیب احمد کو گراؤنڈ میں بھیجا گیا۔ یہ صورتحال کسی بھی کھلاڑی کے لیے آئیڈیل نہیں تھی۔ خاص کر ایسے موقع پر جب فائنل میچ کے ساتھ ساتھ ایک قومی سطح کی ٹیم میں منتخب ہونے کا مشکل مرحلہ بھی درپیش ہو۔

شعیب احمد دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ کریز پہ پہنچا۔ وکٹوں پہ موجود اس کا دوسرا ساتھی

بھی ایک اوور پہلے آیا تھا۔ دو نئے کھلاڑی کریز پہ موجود تھے۔ تقریباً 9 رنز فی اوور کی اوسط سے انہیں رنز بنانے تھے۔ یہ خوف بھی تھا کہ ان دونوں کے بعد کوئی بھی مضبوط بلے باز پیچھے ڈگ آؤٹ میں موجود نہیں تھا۔ ایسی صورت میں فطری طور پر دونوں شدید دباؤ میں تھے۔

خاص کر شعیب احمد کو ایسا لگ رہا تھا قلندرز کا سکندر بننے کا جو خواب اس نے دیکھا تھا، وہ شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔

اگلے دو اوورز میں وہ دونوں کوئی باؤنڈری نہ لگا سکے۔ تیرہویں اوور میں شعیب احمد نے رسک لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے ہاتھ تھوڑے کھول دیے۔ اس اوور میں اُس نے دو چوکے لگائے۔ اوور کی آخری گیند پہ چھکا لگانے کی کوشش میں آؤٹ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ گیند اڑتی ہوئی لانگ آن کی طرف گئی۔ بالکل باؤنڈری لائن کے پاس کھڑے کھلاڑی نے اپنے دائیں جانب جھکتے ہوئے، گیند پکڑنے کی کوشش کی۔ گیند ہاتھوں میں آئی بھی مگر قسمت اچھی تھی کہ ٹکراتی ہوئی زمین پر گر پڑی۔ دو رنز بنے۔ ساتھ ہی نئی زندگی بھی مل گئی۔

چودہویں اوور میں ایک اور جھٹکا لگا۔ دوسرا کھلاڑی آؤٹ ہو کر باہر چلا گیا۔ باہر سے جو نیا لڑکا آیا ویسے تو اس کی پہچان آل راؤنڈر کے طور پر تھی مگر زیادہ تر وہ باؤلنگ میں مہارت رکھتا تھا۔ بوجھ شعیب احمد کے کندھوں پہ مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔ تماشائی اب اس کا نام لے لے کے آوازیں لگا رہے تھے۔ کوارٹر فائنل جیسی اننگ کھیلنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

پندرہویں اوور میں شعیب احمد دو ہی گیندیں کھیل سکا۔ ایک میں چوکا لگا۔ دوسری میں سنگل رن بن سکا۔ 15 ویں اوور کے اختتام پر ٹیم کا سکور 75 رنز تھا۔ اس کے پانچ کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔ اب آخری 5 اوورز میں 64 رنز درکار تھے۔

سولہویں اوور کی پہلی گیند شعیب احمد نے کھیلی۔ ایک رن بنانے کا موقع تھا۔ یہ رن بنایا

لیکن یہ رن بہت مہنگا پڑ گیا۔ اگلی گیند نے ساتھی کھلاڑی کی وکٹیں اڑا دیں۔ پریشر پہاڑ بن کے کھڑا ہو گیا۔

نیا کھلاڑی منصور تھا۔ وہ فاسٹ باؤلر تھا۔ کبھی کبھار اس کا بلا بھی چلتا تھا۔ شعیب نہیں جانتا تھا، منصور کی وجہ سے وہ فائنل میچ کھیل رہا تھا۔ عالیہ نے اس سے جو باتیں اگلوائی تھیں، انہی کی بنیاد پر جنید رضا کو مجبور کرایا تھا۔ ورنہ خدا جانے شعیب احمد کا کیا حشر ہوتا؟

اس اوور کی اگلی چار گیندوں پر وہ دونوں 4 ہی رنز بنا سکے تھے۔ 17 ویں اوور کی باؤلنگ کے لیے اردو ڈپارٹمنٹ کا سب سے خطرناک باؤلر عمار حسن سامنے آیا۔ اس نے پہلے سپل کے دو اوورز میں اکنامکس ڈپارٹمنٹ کی کمر یکے بعد دیگرے تین وکٹیں لے کے توڑ دی تھی۔ اس جھٹکے کے بعد وہ سنبھل ہی نہ سکے تھے۔

عمار حسن کے دو اوورز باقی تھے۔ اب شعیب احمد کی اصل آزمائش شروع ہو گئی تھی۔ اسے سینکڑوں سٹوڈنٹس کے اعتماد پر بھی پورا اترنا تھا۔ قلندرز کے سکندر کے لیے بھی خود کو منوانا تھا لیکن حالات اس کے لیے کسی بھی طرح سازگار نہیں تھے۔

عمار حسن کی پہلی ہی گیند ایک خطرناک یارکر کی شکل میں اس کے بائیں پیر کے بالکل قریب پڑی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے سیدھے بیٹ سے یہ خطرناک گیند روکی تھی۔ اگلی گیند آف سٹمپ پہ پڑ کے بلند ہوئی تھی۔ شعیب احمد نے پورے اعتماد سے اسے کٹ کیا۔ گیند برق رفتاری سے سلپ اور گلی کے درمیان سے ہو کر تھرڈ مین کے باہر چار رنز کے لیے چلی گئی۔ اس شاٹ سے اُس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اگلی گیند باؤلر نے چوکے کے ردعمل میں باؤنسر کی شکل میں پھینکی۔

شعیب احمد کو اندازہ ہو گیا تھا عمار حسن چوکے کا حساب باؤنسر کر کے کرے گا۔ وہ

ذہنی طور پر تیار تھا۔ توقع کے مطابق جب باؤنسر پھینکا تو اس نے گیند کی اٹھان سمجھ کے اپنا بلا ہوا میں گھمایا۔ گیند اور بلے کے ٹکرانے کی دل کش آواز گونجی۔ ساتھ ہی گیند وکٹ کیپر کے سر کے اوپر بہت اونچی پرواز کرتی ہوئی باؤنڈری کے باہر جا گری۔ لگا تار چوکے اور چھکے نے حامی تماشائیوں کے جوش وخروش میں اضافہ کر دیا تھا۔ خود شعیب احمد بھی اب پریشر سے باہر آ گیا تھا۔ اگلی گیند پہ ایک رن بن سکا۔ اوور کی آخری گیند میں منصور بیٹنگ کے لیے کریز پہ تھا۔ عمار حسن نے بہت ہی تیز گیند کی۔ جسے منصور بالکل ہی نہ سمجھ سکا۔ وہ کلین بولڈ ہو گیا۔

اب تین اوورز اور تین وکٹیں باقی تھیں۔ جبکہ جیتنے کے لیے 46 رنز درکار تھے۔

18 واں اوور پھینکنے کے لیے جو باؤلر سامنے آیا وہ لیگ سپنر تھا۔ شعیب احمد اسے کھیلتے ہوئے دشواری محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا کہ اس باؤلر کو ٹارگٹ کرے گا۔ جتنا بھی ہو سکے اس اوور میں منزل کی طرف پیش قدمی تیز کرے گا۔ اس نے نئے آنے والے ساتھی کو بھی سمجھایا۔ زیادہ سے زیادہ خود کھیلنے کے اپنے فیصلے سے اسے آگاہ کیا۔

یہ اس کا عزم تھا، اس کا حوصلہ تھا۔ اس کا اعتماد اور صلاحیت تھی کہ اس نے اپنے فیصلے کے مطابق اس اوور میں ایسی دلکش شاٹس لگائیں کہ ساتھی سٹوڈنٹس تو جھوم جھوم کے، بازو لہرا لہرا کے اسے داد وتحسین دے رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی لاہور قلندرز کی سلیکشن ٹیم بھی واہ واہ کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

اس اوور میں شعیب احمد نے دو چھکے اور دو چوکے لگائے۔ آخری گیند پہ ایک رن بنا کے اگلے اوور کے لیے سٹرائیک اپنے پاس ہی رکھ لی۔ کھیل ایک ڈرامائی صورت حال اختیار کرتے ہوئے اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کی کشتی جو ابتدا میں ہی

گرداب میں پھنس گئی تھی، شعیب احمد نے ایک بار پھر ساحل کی امید جگادی تھی۔ سینکڑوں طلبا وطالبات حلق پھاڑ پھاڑ کے، اس کا نام لے لے کے چلا رہے تھے۔

داد و تحسین کی ان سینکڑوں آوازوں میں ایک آواز ایسی بھی تھی جس کی سرگوشی، دل کی سرگوشی بن کے زبان سے نکل رہی تھی۔ وہ عالیہ کی شدتِ جذبات سے مغلوب آواز تھی۔ اس آواز میں فخر بھی تھا۔ تشکر بھی تھا۔

19 واں اوور پھینکنے کے لیے عمار حسن ایک بار پھر تیار تھا۔ یہ بڑا اہم اور فیصلہ کن اوور تھا۔ اب اکنامکس کو جیتنے کے لیے 12 گیندوں پہ 25 رنز کی ضرورت تھی۔

عمار حسن بھی ٹیم کی فتح کے علاوہ، اپنی جیت کے لیے بھی بازی کھیل رہا تھا۔ قلندرز کے سکندر میں منتخب ہونے کا جذبہ اسے بھی تھا۔ یہ دونوں ہی کھلاڑی ایسے تھے جو قلندرز کے سکندر کے مضبوط امیدوار تھے۔ یہ اوور ایک طرح سے ان دونوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا تھا۔

پہلی گیند کو شعیب احمد خاطر خواہ طریقے سے کھیل نہیں سکا۔ کوئی رن نہ بن سکا۔ دوسری گیند کی رفتار اتنی کم تھی کہ وہ مکمل بیٹ ہو گیا۔ تیسری گیند لیگ سٹمپ پہ پڑی۔ اسے ہلکا سا بَیٹ دکھایا۔ گیند گولی کی سی تیزی سے فائن لیگ کے باہر چوکے کے لیے چلی گئی۔ اگلی گیند مڈ آن کی طرف کھیلا۔ ایک رن کے لیے دوڑا۔ اب عمار حسن کے سامنے نیا بلے باز تھا۔ نئے بلے باز نے بھی اپنا جوہر دکھانے کی ٹھان لی تھی۔ اس نے پہلی ہی گیند کو بہت زور سے شاٹ لگائی۔ گیند خطرناک طریقے سے کور کی طرف دو کھلاڑیوں کے سروں کے قریب سے ہوتی ہوئی چار رنز کے لیے باہر چلی گئی۔

اب آخری گیند رہ گئی تھی۔ شعیب احمد نے اسے اشارہ کیا کہ کھل کر کھیلے۔ ایک رن بنانے کی بجائے باؤنڈری لگانے کی کوشش کرے۔ عمار حسن بھی ان کے ارادے کو سمجھ گیا تھا۔ اس

نے گیند کی۔ یہ کم رفتار کی فل ٹاس تھی۔ بلے باز اسے زوردار انداز میں کھیلنے کے لیے ایک دو قدم آگے بڑھا۔ وہ صحیح طرح ٹائم نہ کرسکا۔ گیند بلے سے ٹکرا کے مڈآن کی طرف گئی۔ اور ایک آسان کیچ کی شکل میں آٹھویں بلے باز کی اننگ کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی عمار حسن نے 5 وکٹوں کا سنگ میل عبور کیا۔

اکنامکس ڈپارٹمنٹ کے لیے وکٹ گرنا مسئلہ نہیں تھا۔ اب بھی دو کھلاڑی باقی تھے۔ آخری اوور تھا اور 16 رنز درکار تھے۔

آخری اوور پھینکنے کے لیے اردو ڈپارٹمنٹ کا ایک اچھا فاسٹ باؤلر تیار تھا۔ اس کے سامنے شعیب احمد مردِ بحران اور مردِ میدان بن کے کھڑا تھا۔ اس کی ایک اور دل کش اننگ نے باؤلر کو پریشر میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسی پریشر کی وجہ سے اس کی پہلی ہی گیند وائیڈ قرار دی گئی۔ دوسری گیند میں بھی وہ اپنی لائن چوک کر گیا۔ شعیب احمد نے شارٹ پچ گیند کو بڑی آسانی سے چوکے میں بدل دیا۔ اگلی گیند مڈوکٹ کی طرف کھیل کے دو رنز بنا لیے۔ اب چار گیندوں پہ 9 رنز چاہئیں تھے۔

تیسری گیند باؤنسر تھی۔ شعیب احمد نے اپنے بلے کو تلوار کی طرح گھمایا۔ گیند بلے سے ٹکرائی اور فضا میں اڑتی ہوئی لانگ لیگ کے باہر چھ رنز کے لیے چلی گئی۔ اب دو گیندیں تھیں اور تین رنز تھے۔

شعیب احمد نے ایک بار پھر ناقابل یقین کارکردگی دکھا کے اپنی ٹیم کو جیت کے دھانے تک پہنچا دیا تھا۔ پانچویں گیند باؤلر نے بہت آہستہ رفتار سے پھینکی۔ شعیب احمد اسے سمجھ ہی نہ سکا۔ گیند اس کے قریب سے گزرتی ہوئی وکٹ کیپر کے پاس چلی گئی۔

پورے گراؤنڈ میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ سینکڑوں دل اس گیند پہ فاتحانہ سٹروک کی توقع

میں دھڑک رہے تھے۔ ان کی دھڑکنیں جیسے بے قابو ہو گئیں۔ لاتعداد ہاتھ فتح کے جوش سے اٹھنے والے تھے۔ وہ بے اختیار اپنے سروں پہ رکھ دیے گئے۔

اب آخری گیند تھی۔ آخری سٹروک تھا۔ فتح یا شکست کا آخری اعلان تھا۔ سینکڑوں دل دھڑ دھڑ کر رہے تھے۔ بے شمار آنکھیں پلک جھپکائے بغیر ایک گیند اور ایک سٹروک کا فیصلہ کن نظارہ کرنے کی تمنا میں منتظر تھیں۔

گیند پھینکی گئی۔ تیزی سے جا کے بلے باز کے سامنے گری۔ شعیب احمد نے اسی اعتماد کے ساتھ زور سے بلا گھمایا۔ گیند اور بلے کے ٹکرانے کی ہیجان انگیز آواز گونجی۔ گیند ٹکرا کے بلند ہوئی۔ بہت بلند...... پھر سینکڑوں، ہزاروں آنکھوں نے ایک سکتے کی سی حالت میں دیکھا۔ وہ بلند ہوتی ہوئی گیند واپس زمین کی طرف آ رہی تھی۔ اندازہ نہیں ہو رہا تھا وہ کہاں گرے گی؟ شاید باؤنڈری لائن کے اندر گرے، شاید چھکے کے لیے باہر جا گرے۔ گیند زمین کے قریب آ گئی پھر باؤنڈری لائن کے اوپر دو بلند ہوتے ہوئے ہاتھوں کے بیچ میں سما گئی۔

سینکڑوں دل جیسے دھڑکنا بھول گئے۔ سانسیں جیسی ساکت ہو گئیں۔ سینکڑوں ہاتھ، جو فتح کے جوش سے اٹھ رہے تھے، ایک اضطراری انداز میں اپنے ہی سروں پہ ملال بن کے جم گئے۔ بے یقین انجام کی اس ساعتِ نافرجام نے بہت سوں کو جیسے پتھر بنا دیا۔

پھر جیسے شہرِ طلسمات کا آسیب ختم ہوا۔ اردو ڈپارٹمنٹ کے حامیوں کی چیخ و پکار اور جوش و خروش نے یہ احساس دلایا کہ بازی الٹ چکی تھی۔ ساحل تک آتے آتے کشتی الٹ چکی تھی۔

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

آخری گیند پہ فتح اپنی چھب دکھلا کے چھپ چکی تھی۔ شعیب احمد کی تنہا جدوجہد اپنے انجام

کو پہنچ چکی تھی۔ وہ خود بھی جیسے سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھا رہا تھا۔ پھر بوجھل بوجھل قدموں سے چلتا ہوا باہر کی طرف آنے لگا۔

گراؤنڈ میں بہت سی آوازوں کا بے تحاشا شور تھا۔ اردو ڈیپارٹمنٹ والے جیت کی خوشی میں جشن منا رہے تھے۔ اکنامکس ڈیپارٹمنٹ والے شکست کے باوجود، شعیب احمد کی شاندار کارکردگی کی داد دے رہے تھے۔

سب کو مگر ایک اور فیصلے کا بھی انتظار تھا۔ یہ فیصلہ فائنل میچ سے بھی زیادہ سنسنی خیز اور اہم تھا۔ سبھی بے چینی سے منتظر تھے کہ کون قلندرز کا سکندر بننے والا تھا؟ جن دو لڑکوں کا چرچا کئی دنوں سے ہو رہا تھا یعنی عمار حسن اور شعیب احمد، ان دونوں نے توقع کے مطابق بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا۔ اب دیکھنا تھا کس کے سر پہ کامیابی کا تاج سجنے والا تھا؟

میچ کے بعد دس منٹوں کا ایک مختصر وقفہ کیا گیا۔ اس دوران دونوں ٹیمیں تازہ دم ہو کر میدان میں آگئیں۔ پہلے میڈلز، نقد انعامات اور ٹرافیاں دی گئیں۔ اس کے بعد لاہور قلندرز کی ٹیم کا باؤلنگ کوچ آصف جاوید مائک کے پاس آیا۔ اس نے دونوں ٹیموں کے کھیل کی تعریف کی۔ کھلاڑیوں کے ٹیلنٹ کو سراہا۔ پھر بڑے ہی سسپنس کے بعد قلندرز کے سکندر کا اعلان کیا۔

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا کہتے ہیں کے مصداق، عمار حسن اور شعیب احمد کو انہوں نے قلندرز کے سکندر پروگرام کے تحت منتخب کر لیا تھا۔ بہت سے سٹوڈنٹس نے ان دونوں کو کندھوں پہ اٹھایا۔ پورے گراؤنڈ کا فاتحانہ چکر لگایا۔

ایک طرف جنید رضا اور اس کے حواری شکست خوردگی کے احساس سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ اپنی ٹیم کی ہار کے افسوس کے ساتھ ساتھ شعیب احمد کی کامیابی کی خفت بھی ان

کے زخموں پہ مرچیں چھڑک رہی تھی۔
شعیب احمد مسرتوں سے بھرا ہوا تھا۔تشکر سے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے جھلملا رہی تھیں۔ان جھلمل کرتی آنکھوں کے ساتھ وہ ایک چہرے کو بے تابی سے تلاش کر رہا تھا۔وہ اپنی کامیابی کی مسرتیں اس چہرے کی بے حد حسین آنکھوں میں پڑھنا چاہتا تھا۔اس کے گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹوں سے اپنی فتح کی تحسین سننا چاہتا تھا۔
عالیہ طلبا و طالبات کے ہجوم میں سب سے پیچھے کھڑی تھی۔اس کے دل پہ غم اور خوشی کی ملی جلی کیفیتوں کی جیسے رم جھم ہو رہی تھی۔اس نے شعیب احمد کو اس مقام تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔جنید رضا کی سازشوں کو ناکام بنا دیا تھا۔اپنے دل کی بازی ہار کے شعیب احمد کو کرکٹ کی بازی میں ایک مثالی شان سے فتح یاب کرایا تھا۔
ہجوم چھٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔وہ بڑی مشکل سے راستہ بناتی ہوئی شعیب احمد کی طرف بڑھی۔قریب گئی تھی،اُس کی نظر پڑی۔وہ تیزی سے سٹوڈنٹس کو یہاں وہاں دھکیلتا ہوا عالیہ کی طرف بڑھا۔پاس آ کے مسرتوں سے بے قابو آواز میں کہا۔"دیکھا عالیہ!کرکٹ کے حوالے سے جو میں نے خواب دیکھا تھا،مجھے اس کی تعبیر مل گئی۔"
اس کا دل بہت بجھا بجھا سا تھا،مگر ہونٹوں پہ مسکراہٹیں سجا کے بولی۔"تمہیں مبارک ہو شعیب احمد!میری دعا ہے تم قلندرز کا سکندر ہی نہیں،قومی ٹیم کا شاہین بھی بن جاؤ۔"
وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جذبوں کی حدت سے بولا۔"مجھے یقین ہے کرکٹ کا میرا جنون ایسا عروج بھی دلا دے گا۔لیکن میرے دل کا جنوں کچھ اور بھی مانگتا ہے۔یہ میں نے تمہیں پہلے بھی بتا دیا تھا۔تم سے میرا تعلق کبھی نہ چھوٹے۔بس یہی میری کامیابیوں کی معراج ہے۔"

عالیہ کے دل میں دھواں سا اٹھا۔ایک گولا سا حلق میں پھنس گیا۔آنکھوں میں ستارے سے چمک اٹھے۔اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دل کے جنون میں ہمیشہ ارمانوں کا خون ہوتا ہے شعیب احمد! ابھی ایسی باتوں کا وقت نہیں۔ابھی تو اپنی کرکٹ کی کامیابیوں کا جشن مناؤ۔مجھ سے تعلق کی تمنا چھوڑ دو۔جب عروج حاصل کرو گے تو مجھ جیسی کئی لڑکیاں تمہاری تمنا میں تڑپ رہی ہوں گی۔''

یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی۔بہت سے طلبا و طالبات کی بھیڑ میں جگہ بناتی ہوئی پیچھے کی طرف آئی۔پھر وہاں سے تیز تیز چلتی ہوئی پارکنگ ایریا میں آئی۔اپنی کار کا دروازہ کھول کے دھپ سے اس میں بیٹھ گئی۔پھر بہت ہی شکستگی سے اپنا سر سٹیئرنگ کے اوپر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔بہت دیر کے رکے ہوئے آنسوؤں کو جیسے راستہ مل گیا۔یہ آنسو،آنکھوں کے چشموں سے نکل نکل کے سٹیئرنگ کو بھگوتے رہے۔

ازل سے محبت قربانی دیتی آئی ہے۔یہ قربانی مانگتی بھی ہے۔عالیہ بھی محبت کی قربان گاہ میں دل کی بازی ہار گئی تھی۔یہ غم اپنی جگہ،اس سے سوا خوشی یہ سوچ کر ہو رہی تھی کہ اس کی قربانی رائیگاں نہیں گئی تھی۔